Al-Masihiyat wa'l-Islam
The Truth of Christianity in the Light of Muslim Thought
By
Allama J.Qalandar
مقدمہ
المسیحیت والاسلام
مصنفہ
علامہ جے۔ قلندر
1895
www.muhammadanism.org
(Urdu)
Oct.12.2004

فہرس

مُقدمة

الحمداللہ رب العالمین ! زمانے نے کیا کیا رنگ بدلا ہے اورابھی دیکھا چاہیے کہ کیا کیارنگ دکھائیگا۔ پر یہ کلام بہت ہی راست ہے کہ صداقت ازلی ہے۔ صداقت عالمگیر ہے ۔زمانہ کا اثراس پر نہیں پڑتا۔ ہاں اتنا توہے کہ طریق استدلال زمانہ کے لحاظ سے ضرور بدل جاتاہے ۔مناظرہ کا ڈھنگ نیا ہوجاتا ہے ۔پُرانے دلائل نئے پیرائے میں پیش کئے جاتے ہیں اور صداقت کے نئے پہلو اور نئے خیالات اس میں نئی حیات ڈالدیتے ہیں۔

اسلام اور دین عیسوی کے مابین جومناظرہ ہے اس کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ہم اس کے ایک زینہ کو ختم کرآئے ہیں ۔ ایسی کتابیں تحریر ہوچکی ہیں جن میں اسلام کے نقص کا بیان ہوا ہے۔ زمانہ اس قسم کی کتابوں کا اورمحتاج نہیں ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے جب ہم اسلام کی فلسفہ اور طرز خیال اوراس کی دینی کتابوں کی روشنی میں دینِ مسیحی کے اصول پر بحث کیا چاہتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کہاں تک شعاع صداقت جواسلام میں موجود ہے ہمیں دین عیسوی کے اہم مسائل کو قبول کرنے میں مدددیتا ہے۔کہاں تک وہ قرآن کے اس فقرہ " مصدق لمابین یدہ" کا مصداق ہے۔

اس کتاب میں ہم نے اسی پہلو کو اختیار کیا ہے اور اسی طبیعت سے شائقین دین اور عاشقان اسلام کی خدمت میں مسیحی دین کے اصول کو نذر کیا ہے۔ اسکے دو حصے ہیں ۔ حصہ اول میں ہم نے عموماً دین کی ماہیت پر بحث کی ہے اور حصہ دوم میں مسیحی دین کے خاص مسائل کی تحقیق ازروئے عقل اور نقل کی ہے اور نقل میں قرآن کو بھی جگہ دی ہے ہم نے اسلام میں صداقت کے ان ذروں کی تلاش کی ہے جو ادھر اُدھر منتشر سے ہورہے ہیں اوران کو مسیحی دین کے قبول کرنے کا زینہ قرار دیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ اسلام میں ایسے ذرہ بے شمار ہیں جن پر آفتاب صداقت کی روشنی پڑرہی ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ اگراسلام ان پر فکر کرے گا تووہ ضرور مسیحی دین کو اختیار کریگا کیونکہ حقیقت تو یہ ہے کہ **" دین مسیحی جامع جمیع صداقت ہے "**۔

حصّہ اوّل

باب اوّل

دین اور فلسفہ

انسان مذہبی شخص ہے۔ فطرت نے اس کو یہ شرافت بخشی ہے کہ وہ بغیر عبادت زندہ نہیں رہ سکتا ہے ۔ وہ کسی نہ کسی کی پرستش ضرور کرتاہے اگروہ خدا کی پرستش نہیں کرتا تو وہ خود کی کرتا ہوگا۔ دنیا کی تواریخ اس امر کی شہادت دے رہی ہے ہر ملک ہر قوم ہر گروہ میں مذہب کا عالمگیر خیال دامنگیر ہے وحشی اقوام میں بھی مذہب کا ذکر بنارہتاہے۔ بعض لوگوں نے تو اس بات کو قبول نہیں کیاہے بلکہ اس پر شک کیا۔ ان کے خیال میں لامذہب قوم بھی دنیامیں پائی جاتی ہے پر یہ ان کی غلطی ہے اوراس کی وجہ صاف ہے۔ اکثر سیاح ملکوں کی سیر کو جاتے اور وہاں کے باشندوں سے چند سوالات کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتاہے کہ ان وحشیوں کے دینی رسوم رموز ہیں اوراس لئے ان کا جاننا غیر شخص کو دشوار ہوتاہے اور وہ اغیار پر اپنے مذہب کے اسرار فاش نہیں کیاچاہتے اوراس لئے یہ خیال پیدا ہوجاتاہے کہ یہ لوگ لامذہب ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ مذہب نے دنیا کواپنا اسیر بنالیا ہے۔ اس نے تمام عالم کے ملکی اورمالی معاملات پر اپنا رنگ چڑھایا ہے ۔ مذہب کے اس عالمگیر اثر نے ہر عاقل کے رو یہ پر یہ سوال پیش کرر کھا ہے کہ **مذہب ہے کیا؟**

یہ سوال نہایت ہی معقول ہے اوراس کے جواب دینے کی کوشش اس کتاب کے حصہ اول میں کی جائیگی۔ اس کی بحث کئی پہلو پر مستعمل ہے اوران کو ہم جداگانہ پیش کیا چاہتے ہیں۔ اکثر یہ جواب دیا گیا ہے کہ دین علم کا نام ہے اس لئے اس باب میں ہم دین اور عقل کے تعلق پر بحث کرینگے۔ اس میں شک نہیں کہ عقل کو دین سے بہت ہی بڑا تعلق ہے اور دین کی باتوں کا جاننا ۔ اس کے مسائل کو دریافت کرنا اور خدا تعالیٰ کے احکام کو سمجھنا عقل ہی کا کام ہے عقل انسانی واجب الوجود کا تصور پیدا کرسکتی ہے اوراس کی بابت بہت کچھ جان سکتی ہے۔ دین کے سب سے بڑے معلم کا یہ قول ہے کہ " حیات! ابدی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کواور عیسیٰ مسیح کو جسے تونے بھیجا ہے جانیں۔"

گو یہ امر بالکل ہی سچ ہے پھر بھی دین فلسفہ کا نام نہیں ہے ۔ دین اور شے ہے اور فلسفہ اور شے ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ بعض اہل فکرنے ایسی غلطی کی ہے کہ دین اور فلسفہ کو ایک کردیا ہے۔ یہی غلطی اہل ہند کے قدیم عالموں سے ہوئی اور یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ انہوں نے فلسفہ کو دین اور دین کو فلسفہ قرار دیا۔ ان کے نزدیک انسان کی اعلیٰ غایت گیان یعنی علم ہے اور جس نے یہ حاصل کیا اس نے سب کچھ حاصل کیا۔

گنوستکون کا بھی خیال اسی طرح کا تھا۔ زمانہ مسیح کے دوسو برس بعد یہ فرقہ جاری ہوا۔ ان کے نزدیک انسان کی نجات گنوسیس یعنی علم پر موقوف تھی اس لئے ان کے خیال میں دین مسیحی محض تعلیمات کا مجموعہ تھا۔ زمانہ حال میں شیلنگ اورہیگل کی فلسفہ نے بھی مذہب کو فلسفہ سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام اور فلسفہ کا تعلق ہم کسی اور موقع پر بیان کرینگے یہاں صرف اس قدر ہے کہ اسلام کے پیرو عقل کے بڑے پرستار ہیں اور دین کے ہر مسئلہ کو منطق اورفلسفہ کی قید میں لانا چاہتے ہیں اور ہر مذہبی عقدہ کو عقلاً کیا چاہتے ہیں۔وہ دین سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے عقل پر ظلم کرتے اور عقل سے مطابقت پیدا کرنے کے لحاظ سے دین پر جبر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عقل عالی معیار ہے جس سے ہر دینی امر طے پاتا ہے۔ وہ گویا عادل منصف ہے جس کا قول قول فیصل ہے۔

ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ عقل انسانی نہایت ہی اعلیٰ جوہر ہے پر دین کے معاملات میں اس کی کوئی حد ہے جس سے اگرہم تجاوز کریں توضرور غلطی میں پڑینگے۔ اس کی یہ حد اس کے واجبی محل پر غور کرنے سے ظاہر ہے اس لئے ہم اس موقع پر اس محل کو پیش کرتے ہیں جہاں سے آگے عقل کو دین میں دخل نہیں ہے۔

عقل کی دوڑ مشاہدات تک رہتی ہے۔ آدمی کا ذہن بمنزلہ آئینہ کے ہے جس پر بذریعہ حواس کے عکس منطبع ہوجاتاہے اوراشیا کا تصور پیدا ہوتاعلم کی تحصیل کا یہی طریقہ ہے اوراگرہم اس بیان کو تسلیم کریں تو یہ بات صاف صاف

ظاہر ہوجائیگی کہ دینی امور کا تصور عقل اس وقت تک پیدا نہیں کرسکتی جس وقت تک وہ اس کے مشاہدے میں نہ آجائیں ۔ دین کا تعلق عیر مرئیات سے ہے اس عالم سے ہے جو عقل سے برتر ہے ان قوانین سے ہے جو فوق الفطرت ہیں اگر ایک لفظ میں کہیں تو یوں کہیں کہ اللہ سے ہے اس واجب الوجود سے ہے جس کا تصور عقل مجرد نہیں کرسکتی یہاں سے دین کا دائرہ اور عقل کی دوڑ عیاں ہے ان دونوں کے محل علیحدہ ہیں۔ پھر تعلق کی صورت کیارہی ؟ صورت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی از حد محبت سے اپنے تئیں انسانی عقل پر ظاہر کرتاہے وہ اسکو اپنے احکام عنایت فرماتاہے اپنی مرضی اورارادے سے آگاہ کرتا ہے اور تب عقل انسانی کو دینی امور کا علم ہوتاہے تب عالم عیر مرئیات کا مشاہدہ انسانی ذہن سے کیا جاتا ۔ اسی کا نام الہام ہے یہ وہ روشنی ہے جس کے ذریعہ سے ہماری عقل روشن ہوجاتی ہے جس کے نور کا عکس جب ہمارے ذہن پر پڑتاہے تو ہم دین کی باتوں کو جاننے لگتے ہیں الہام کے ذریعہ انسان کی عقل مجرد میں نورانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کے باعث وہ عالم نادیدہ تک پرواز کرجاتی اوراس کی رسائی اللہ تک ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اورامر نہایت ہی قابل غور ہے جس کا خیال ان کو نہیں ہوتا ہے جو عقل پر نازاں ہیں وہ بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں بڑا بھاری فساد پیدا ہوگیا ہے اس فساد کا نام گناہ ہے جس کا اثر انسان کے دل اور دماغ دونوں پر پڑا ہوا ہے اور جس کے سبب انسانی عقل اپنے فیصلہ میں غلطی کرتی ہے اس فطری فتور کے باعث عقل دین کے معاملہ میں ناقص اور ضعیف نظر آتی ہے۔

الہام ہی اس نقص کو دفع کرتاہے ۔ خدا خود اپنی پاک روح سے انسان کے دل ودماغ کو پاک کرتا اوراس قابل بناتاہے کہ وہ الہیٰ باتوں کے جاننے کے لائق ہوتے ہیں اس بیان سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

اول ۔ جس کی عقل گناہ کے فتور سے مبرا ہے اس کے دینی فیصلے غلطی سے منزہ ہیں۔ صرف ایسے ہی شخص کے دینی فتوے قطعی حکم رکھ سکتے ہیں۔ جہاں تک ہم کومعلوم ہے دنیا میں صرف ایک ہی شخص ایسا گذرا ہے جس سے یہ فطری فتور کوسوں دور رہا جس کی عقل کو ذات الہیٰ کا پورا پورا علم اور کامل عرفان تھا جو خدا کا اعلیٰ الہام اورمکاشفہ ہے۔ جس کی روح سے سارے انبیاء اور رسول معمور ہو کر دینی امور کو گرفت اور قبول کرسکتے تھے جس کے جلوہ سے ان کی عقل منور ہوتی تھی۔ یہ اعلیٰ الہام اورمکاشفہ سیدنا عیسیٰ المسیح ہے جس نے دین کے مسائل بیان کرنے میں ہرگز غلطی نہیں کی جس نے نبیوں اور رسولوں اورپیغمبروں کی عقل کو اپنے الہام سے روشن کیا اوران کو عرفان حقیقی عطا کیا اس کی روح کے بلوائے وہ بولتے تھے اوراس کے سکھائے وہ اوروں کو سکھاتے تھے پھر نہ صرف وہ ان کا معلوم اور کاشف ہی تھا بلکہ اس نے ان کی الہامی تعلیم کی تصدیق بھی کی اسی بنا پر ہم موسیٰ کی توریت اور داؤد کے زبور اورانبیاء کے صحائف کوالہامی اورمنجانب اللہ مانتے ہیں اسی بنا پر ہم انجیل کو کلام خدا جانتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ صرف سیدنا عیسیٰ مسیح دین کے معموں کا حل کرنے والا ہے وہی دین کا معیار ہے۔

دوم۔دین اور عقل کے مذکورہ الصدر تعلق سے یہ امر مدلل ہے کہ دینی مسائل کے سمجھنے کے لئے منطق اور فلسفہ کی ضرورت اس قدر نہیں ہے جس قدر نیک طینت اور پاک طبیعت کی ضرورت ہے۔ منطق اور فلسفہ عمدہ چیز ہیں اور ان سے دین کی باتوں کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے پر صرف ذہنی مذاق کا شخص اگر چاہے کہ دین سے فائدہ اٹھالے تو یہ امر دشوار ہے۔ وہی شخص دین سے فائدہ اٹھاسکتا ہے جو گناہ کے فتور سے آزاد ہونے کی خواہش رکھتا ہو جو عشق الہیٰ کا طالب ہو۔جس کی روح خدا کی پیاسی ہو جو اس کے لئے ترستی ہو۔

اس بحث میں جس کو ہم نے اٹھائی ہے اور جس میں عقل اور دین کے تعلق کا ذکر کیا ہے ہم یہ دکھائے آئے ہیں کہ عقل الہام کی محتاج ہے اب آگے چل کر ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ الہام ہونے پر عقل کا منصب کیا ہے ہم کیونکر اس سے کام نکال سکتے ہیں۔ واضح ہو کہ دین کی باتوں کا اعلان بتدریج کیا گیا ہے الہیٰ صداقت رفتہ رفتہ انسان تک پہنچی ہے۔ جس قدر انسان میں حقانیت کے قبول کرنے کی قابلیت پیدا ہوتی گئی اس قدر اس کا ذکر اس سے کیا گیا اس کی مثال آفتاب سے دیجاسکتی ہے جو بتدریج اپنی روشنی زمین پر پھیلاتا ہے۔ الہام کی یہی کیفیت ہے۔خدا آہستہ آہستہ اپنی امت کی تربیت کرتا رہا۔ اب عقل کا یہ کام ہے کہ صداقت کے ذروں کو ایک جاجمع کرے۔ جو تعلیم بوقت دی گئی ہے ان کو اکٹھا کرے۔ علاوہ بریں صداقت کے مختلف پہلو ہوا کرتے ہیں اور ان کا اظہار موقع بموقع کیا گیا ہے۔ عقل کا کام یہ ہے کہ ان جداگانہ پہلو کو ترتیب دے اور اس کے

واجبی محل کو ظاہر کرے اور سلسلہ تعلیم میں کم فہم کو بادی النظر اختلاف نظر آئے ان کو دفع کرے۔ یہی عقل کا واجبی محل ہے اور یہی اسکا لائق منصب ہے۔ سچ ہے کہ عقلِ انسانی محدود ہے۔ اس سے کیا مراد ہے ؟ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقل بالذات ہی ضیعف ہے۔ نہیں کیونکہ جہاں تک اس کی رسائی ہوتی ہے اس کا حکم اختیار اور یقین کے ساتھ ہوتا ہے پر بات یہ ہے کہ الہیٰ نظام اور دینی امور ایک عظیم الشان کلی ہے جس کے اجزا کثیر ہیں اور عقل کی پہنچ صرف جز تک ہے اس لئے عقل محدود ہے اور اس کا حکم بھی محدود ہے۔ ارسطاطالیس کا قول ہے کہ " علم کا اشتیاق یقین کا شوق ہے یعنی جس بات کو انسان جاننا چاہتا ہے اس کو یقین کے ساتھ جاننا چاہتا ہے۔ انسانی تجربہ ہمارے علم کا معیار ہے۔ جو باتیں ہمارے تجربہ میں آجاتی ہیں ان کا یقین ہم کو پیدا ہوتا ہے اور جس قدر وہ ہمارے تجربہ میں آتی ہیں اسی قدر وہ ہمارے یقین میں رہتی ہیں۔ پر ہر شخص کے ذاتی تجربہ کے علاوہ دیگر اشخاص کا تجربہ بھی ہوا کرتا ہے جس کا خیال اہل فکر کو کرنا پڑتا ہے۔ ہم صرف شخصی ہی تجربہ پر کفایت نہیں کرتے بلکہ غیر کے تجربے سے بھی مدد لیتے ہیں ہمارے علم کا بڑا بھاری جز کسی غیر شخص کی شہادت اور اختیار پر موقوف ہے اور یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ جب تک وہ دیگر اشخاص کی شہادت اور یقین پر موقوف ہے تب تک ہمارا علم ممکنات پہنچتا ہے دین کے متعلق عقل کا فیصلہ اسی طور ہوا کرتا ہے۔ وہ ہم کو یہ بتادیتی ہے کہ فلاں امر ممکن ہے۔جب اولاً وہ امر ہمارے امکان کے دائرہ میں آجاتا ہے تب وہ بعد ہ ہم کو اس کا یقین ہوتا ہے۔

یہاں سے ایمان کا دائرہ شروع ہوتاہے اور وہ جس کو عقل نے ممکن بتایا تھا اب ایمان یقینی بتاتاہے۔ اب بذریعہ ایمان شک شکوک کی گنجائش بالکل جاتی رہتی ہے جس کا احتمال امکان میں تھا۔

اس بحث میں یہ بھی خیال رکھنا امر ضروری ہے کہ دین میں ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو عقل سے نہایت ہی اعلیٰ ہیں وہ عقل کے خلاف تو نہیں ہیں پر عقل سے برتر اور بزرگتر ہیں ایک نہایت قدیم عالم مسیحی آگستین نے اس امتیاز کی جانب ہماری توجہ شروع میں دلائی تھی اوراب ہم بھی اس فرق کو عقل کے پرستاروں کے نزدیک پیش کرتے ہیں ہوسکتاہے کہ دین کی باتیں عقل کے خلاف نہیں پر عقل سے برترہوں۔ اس کی توضیح یوں کی جاسکتی ہے۔

فلسفہ کی لغت میں اکثر تین الفاظ کا رواج بہت ہی بڑاہے۔ وہ الفاظ علت اول۔ لامحدود ہیں۔ ذات باری تعالیٰ پر ان کا اطلاق برابر ہوا کرتا ہے۔ علت اول سے مراد وہ سبب اول ہے جو کسی کا سبب نہیں پر جس کے سبب اور سب ہیں۔ مطلق سے مراد وہ وجود ہے جو بذات خود بلاکسی قسم کے تعلقات خارجی موجود ہے۔ لامحدود سے ایسی ذات مراد ہے جو ہر حد سے مبرا ہے اور جس کی ازلی ہستی کی ازلی صورت میں کوئی صفت جوازل سے اس میں نہیں زاید نہیں کی جاسکتی۔

خیال کرنے کا مقام ہے کہ علت اول اور مطلق اورلامحدود کا تصور ایک ہی وجود میں عقلاً محال نظر آتاہے ۔ دیکھیئے کہ وہ جو علت اول ہے بحیثیت علت ہونیکے کیونکر مطلق ہوسکتاہے۔ اسی طور سے وہ جو مطلق ہے بحیثیت مطلق ہونیکے کیونکر علت ہوسکتا ہے ۔ علت تو معلول کے تعلق کے لحاظ سے علت ہے۔ علت اپنے معلول کا علت ہے اور معلول اپنی علت کا معلول ہے پر وجود مطلق کے تصور میں تعلقات کا خیال مفقود ہے پس کیونکر ایک ہی وجود علت اول اور مطلق بھی ہوسکتا ہے۔ عقلاً یہ امر محال ہے ۔ اس وقت کے دفع کرنے کے لحاظ سے دلیل یوں قائم کی جاتی ہے کہ وجود مطلق اولاً بالذات خود موجود ہے اور بعدہ کسی وقت اور زمانہ میں علت قرار پاتا ہے اس لئے ایک ہی وجود علت اول اوروجود مطلق بھی ہوسکتاہے پر اس خیال کی مزاحمت لامحدود کے تصور سے ہوتی ہے کیونکہ لامحدود کس طریق سے ایسا کچھ بن جاسکتاہے جو ابتدا سے وہ نہیں تھا اگر علت کی حیثیت موجود ہونے کی ممکن صورت ہے تو وہ جو بلاعلت ہوئے موجود ہے لامحدود نہیں ہوسکتاہے کیونکہ اس کا علت نہ ہونا اس کے لئے ایک حد قرار دیجائیگی اور یہ تصور لامحدود کو واجب نہیں اور اس میں یہ بھی نقص آجائیگا کہ وہ جو ابتدا میں علت نہ تھا بعد کو علت ہوا اور یوں اپنے اول حد اور دائرہ سے تجاوز کرگیا۔

ہم اس تقریر کو طول دے سکتے ہیں پر ہمارے مقصد کے لئے یہ کافی ہے۔ دعویٰ ہمارا یہ تھا کہ دین میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو عقل میں آتی ہیں اور نیز ایسے امور بھی پائے جاتے ہیں جو عقلاً محال نظر آتے اور پھر بھی ہر شخص سے جو واجب الوجود کا قائل ہے مقبول صورت ہیں۔ ان امور کو ہم عقل کے خلاف نہیں تصور کرتے بلکہ عقل سے اعلیٰ اور برقرار دیتے ہیں۔ یہ باتیں ایسی ہیں جو محض عقل مجرد سے انسان کے فہم میں نہیں جس کے قبول کرنے میں ہماری

ساری قوتیں دل اور دماغ کی ساری حرکتیں معاون اورمددگار ہوتی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسانی عقل کے علاوہ انسان پاس کوئی اور قوت اور مادہ بھی ہے جس سے وہ دین کے معاملات میں فائدہ اٹھاتاہے اور جس کے بغیر وہ بے دین رہے جاتاہے اس خداداد قوت کا نام ایمان ہے۔

باب دوم

دین اور اخلاق

باب اول میں ہم نے دین اور فلسفہ پر بحث کی اس باب میں ہم دین اوراخلاق پر فکر کیا چاہتے ہیں۔ عام گفتگو میں لفظ اخلاق کا استعمال بہت ہی محدود معنی میں کیا جاتاہے ہم اکثر اس شخص کو خلیق کہتے ہیں جو اپنے برتاؤ میں خوش اسلوب ہوپر یہاں ہم نے لفظ اخلاق کو وسیع معنی میں استعمال کیاہے اس سے فی الحقیقت علم الاخلاق یا جس کو انگریزی زبان میں مارل فلاسفی او رایتھکس Ethics کہتے ہیں مراد ہے۔ اس آخر الذکر لفظ سے اخلاق کا مفہوم صاف ہوجاتاہے۔ ایتھکس یونانی لفظ ηφικα سے مشتق ہوا ہے یونانی زبان میں اتیھوس کے معنی سیرت یا چال چلن کے ہیں اور وہ علم جسمیں انسانی سیرت یا نیکی کا بیان پایا جائے ایتھکس یعنی علم اخلاق ہے۔

علم اخلاق کی یہ تعریف اس امر کو صاف ظاہر کررہی ہے کہ واقعی میں دین کو بڑا بھاری تعلق ایسے علم سے ضرور ہوگا جس میں نیکی کی ماہیت اور اقسام اور نیز اسی طرح کی باتوں کا ذکر ہو کیونکہ یہ باتیں ایسی ہیں جو دین میں بھی پائی جاتی ہیں حق تو یہ ہے کہ دین غایت اخلاق کی تعلیم اوراس کی اصلاح ہے انسان دین کی پیروی اس غرض سے کرتاہے کہ وہ نیک سیرت ہوجائے ورنہ دین اور بے دینی میں کسی طرح کافرق نہیں رہ سکتاہے۔

دین اوراخلاق کے اس تعلق کو واجبی طور سے سمجھنے کے لئے یہ لازمی معلوم پڑتاہے کہ ہم اخلاق کے وسیع دورپر ایک سر سری نظر میں پھیریں اوردیکھیں تو صحیح کہ وقت بوقت اخلاق کے عالم میں کون سے مختلف خیالات پیش کئے گئے ہیں اور دین نے ان پر کیا کچھ اثر کیا ہے اور کون سی نئی بات اس میں پیدا کردی ہے۔

اخلاق کے باب میں یونان کے حکماء نے بڑی دردسری کی ہے اوراس میں شک نہیں کہ انہوں نے فی زمانہ کے علماء کے لئے کئی طور سے راہ صاف کردی ہے ۔ سقراط اور افلاطون کے قبل یونانی علم اخلاق نے تو خوبی نہیں دکھائی کیونکہ اس زمانہ کے لوگ زندگی کے معاملات پر ایسی فکر سے خیال نہیں کرتے تھے جیسے ان کے مابعد کے لوگوں نے کئے ۔ تھوڑا بہت جو کچھ وہ جانتے تھے سو اپنے طریق پر مختصر عبارت میں ادا کرلیا کرتے تھے مثلاً ان کا کہنا تھا کہ " ہر گز زیادتی نہ کرو"۔یا" تو اپنے کو پہچا نو" یا " دوسروں کی بھلائی کا نام انصاف ہے" ایسے مختصر اقوال سے ہم ان کے اخلاق کے معیار کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ پر یہ حالت ایک عرصہ کے بعد جاتی رہی اورحکماء کے خیالات زیادہ روشن ہوگئے ہم اس باب میں ہر فلاسفر کے

خیال کی تحقیقات نہیں کرسکتے ہیں۔ پر ان کے لب لباب کو ناظرین کے گوش گذار کیا چاہتے ہیں۔

نیکی کیا ہے ؟ اس بھاری سوال کا جواب قدیم اور جدید اہل علم نے مختلف طور پر دیا ہے۔ ان میں سے جو خاص اور قابل توجہ ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ نیکی علم ہے۔ اگر کوئی طالب علم افلاطون سے نیکی کے باب میں سوال کرتا کہ وہ کیا ہے تو اس کا جواب یہی ہوتا نیکی علم کا نام ہے۔ سقراط کا اصول بھی یہی معلوم پڑتا ہے۔ وہ بھی نیکی کو علم تصور کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ نیکی کی یہ تعریف دقت سے خالی نہیں ہے۔ بڑی دقت جو افلاطون کو خود اس کے بیان کرنے میں ہوئی اور جس کا جواب کچھ نہیں بن پڑا یہ ہے کہ اگر نیکی علم کا نام ہے تو کیوں وہ اور علوم کے موافق قابل تعلیم نہیں ہے کیا سبب ہے کہ وہ بذریعہ عقل کے تحصیل نہیں کی جاتی ہے۔ یہ تو تجربہ کی بات ہے کہ اکثر ایسے عالم بھی ہیں۔ جو نیک نہیں ہیں گو ان کے پاس علم ہے پر نیکی نہیں ہے اور پھر ایسے نیک اشخاص دنیا میں پائے جاتے ہیں جو علم سے بالکل محروم ہیں پر ان کی نیکی قابل تعریف ہے۔

ہند کے رشیوں نے بھی میری دانست میں نیکی کو گیان اور بدی کو اگیان قرار دیا ہے اس کا سبب یہی معلوم پڑتا ہے کہ انکے نزدیک انسانی عقل کا منصب سب سے اعلیٰ اور بزرگ تر تھا اور انہوں نے اپنے خیالات اور دیگر امور کے فیصلے اسی انسانی عقل کے اعتبار سے کئے اور اس لئے دل کی خرابی اور بدی کو ذہن کا نقص خیال کیا اور اس لئے اس کو بے علمی یا اگیان بتایا۔

کیا اخلاقی خوبی یا نیکی ذہن کی تربیت سے حاصل کی جاسکتی ہے؟ کیا نیکی کا علم اور اس کا عمل ایک ہی شے ہے؟ کیا نیکی اور علم مترادف ہیں؟ افلاطون اور ارسطاطالیس اور جتنے قدیم یا جدید معلم ایسا جواب دیتے ہیں وہ اس امر کو فراموش کردیتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں ایسا نقص بھی گیا جس کے باعث اس کی مرضی مجھول پڑگئی ہے حتیٰ کہ وہ نیکی کو نیکی جانتا ہے اور پھر بھی اس پر عمل نہیں کرتا ہے۔

اسی موقع پر دین کا تعلق جو اخلاق کے ساتھ ہے بدیہی نظر پڑتا ہے اخلاق کی اس کمی کو صرف دین ہی کا کام ہے کہ دور کرے دین ہی کے ذریعہ سے اخلاق کے قانون کی تعمیل کی صورت نکلتی ہے اور وہ قوت حاصل ہوتی ہے جس سے صرف ہم نیکی کا علم حاصل کرتے بلکہ نیک بھی بن جاتے ہیں اگر دنیا میں کوئی ایسا مذہب ہو جس سے یہ غرض پوری نہیں ہوتی تو لاریب وہ دین کے نام سے یاد کئے جانے کے لائق ہی نہیں ہے۔

۲۔ راحت۔ دنیا میں ایسے بھی معلم گذرے ہیں جنہوں نے یہ تعلیم دی کہ ہر فعل جو راحت بخش ہے نیکی ہے۔ خوش ہونے کے لحاظ سے نیکی کرنی چاہیے۔ راحت ہی حاصل کرنی انسان کا خاص فرض ہے۔ یہ راحت اپنے کو پیار کرنے سے ملتی ہے۔ یہ خودی سے مطمئن ہے اگر دوسروں کا خیال اس خوشی میں

شامل ہے تو وہ صرف ادنیٰ درجہ کا ہے اس سے اپنی ذاتی خوشی مقصود ہے چند معلموں نے اس رائے پر اعتدال سے زیادہ تاکید کیا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ " آؤ ہم کھائیں پیئں کہ کل مرینگے "۔ افکوریوں کا یہی مقولہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس خیال سے ہر قسم کی بد پرہیزی اور عیاشی اور بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے اس خیال کے موافق اخلاق کا معیار خدا نہیں پر خود قرار پاتا ہے نیکی اس لئے نیکی ہے کہ اس سے ذاتی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ افادہ اور استفادہ ۔ زمانہ حال میں اخلاق کے اس خیال نے بڑا عروج پکڑا پیلی اور بنتھم اور جان سٹوڑٹ مل اور ان کے ہم خیالوں نے یہ رائے قائم کی کہ ہر فعل بلحاظ ذاتی فائدہ اٹھانے اور غیروں کو فائدہ پہنچانے کے نیک قرار دیا جاتاہے۔ اس فلسفہ کا نام انگریزی زبان میں یوٹی لی ٹیرئین فلسفہ ہے۔ اس فلسفہ نے اپنے مسائل کی کئی طور سے تشریح کی ہے بعض نے اس کی تاویل دین کا لحاظ رکھ کر کیاہے۔ مثلاً پیلی نے یہ بتایا کہ ہر فعل جو اخلاقی فرض میں شامل ہے خدا کے احکام سے صادر ہوتاہے اور ذاتی خوشی اور غیر کا فائدہ خدا کی شریعت کے لحاظ سے پہنچا جاتا ہے بعض نے افادہ اور استفادہ کے قانون کی تعمیل وہیں تک جائز رکھی ہے جہاں تک ہر شخص کا ذاتی فائدہ عوام کے فائدہ سے ضرر نہیں اٹھاتاہے بعض اصحاب تو یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ وہ اس قانون کا اطلاق صرف غیروں پر کرتے اور اس سے اوروں کے افعال کی یا تعریف یامذمت کرتے ہیں۔

۴۔ حیولانی قیاس۔ حیولامادہ کو کہتے ہیں سیدنا مسیح کے دوسو برس بعد ایک مذہب دنیامیں پیدا ہوا جس کو " نیو پلیٹو نزم(Neo Platonism) کہتے ہیں اس کے معلم پلوٹنس نے حیولاکو اول بدی اور " سوما" یعنی جسم کو " بدی ثانی" بتایا۔ اس خیال کا ذکر یہاں اس لئے کیا جاتاہے کہ ہمارے ملک ہند میں عموماً اس حیولانی قیاس نے اپنا اثر بہت کچھ ڈال رکھاہے ہندوؤں میں یہ خیال موجود ہے اوراسی لئے نیک ہونے کی خواہش سے عابد ہندومادہ اور جسم اور اندریوں سے رہائی چاہتاہے اسی لئے گھر دوار کو چھوڑنا اور جنگل میں نکل جانا اور یوگ سادھنا نیک ہونے کے ذریعے ہیں۔

جن باتوں کا ذکر ہم نے اوپر کیا اس سے ظاہر ہے کہ عموماً اخلاق کا خیال لوگوں میں دین کے اعتبار سے نہیں پر سوسائٹی کے اعتبار سے جاری تھا اخلاقی خوبیاں وہی تھیں جن سے ملک اور سرکار کو تعلق تھا یعنی ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ سوشی ال خوبیاں تھیں اکثر اخلاقی فلسفہ کے مصنف **شجاعت** اور **ہمت** اور **عدالت** اور **راستی** کا بیان کرتے ہیں یہ ایسے اوصاف ہیں جو ملکی یا باہمی تعلقات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگراس بات کا خیال ہم رکھیں تو میری دانست میں دین اوراخلاق کا تعلق نہایت ہی واضح ہوجائیگا اور یہ بھی روشن ہوجائیگا کہ دین نے اخلاق میں کیا کچھ رنگ پیدا کردیا ہے اوراس کی صورت کہاں تک بدل دی ہے

اوراس میں کیسی قوت ڈالدی ہے۔ مسیحی دین نے اخلاق کا ایک نیا تصور پیدا کردیا ہے۔ اس تصور میں ذیل کے نکات قابل عور ہیں۔

۱ ۔ازروئے دین شریعت کا خیال نیکی کے ساتھ بالکل چسپاں ہے حتیٰ کہ ہم ان دونوں کو کسی طرح سے علیحدہ نہیں کرسکتے اس شریعت کی دوصورتیں ہیں اول " کانشنس " یا "ضمیر " افسوس کی بات ہے کہ اردو زبان میں لفظ کانشنس Conscience کے لئے کوئی موضوع لفظ نہیں پایا جاتا ہے ضمیر گو اکثر اردو تحریرات میں استعمال کیا گیا ہے پر اس سے کانشنس کا پورا مطلب ادا نہیں ہوتا۔لفظ کانشنس دو الفاظ سے مرکب ہے یعنی کان بمعنی ساتھ اور سائینشیا بمعنی علم یہی حال یونانی لفظ ευυειψγ سون ایدیس اس کا ہے جس کے لغوی معنی بھی وہی ہیں جو کانشنس کے ہیں۔"سون" بمعنی ساتھ اور ایدیس اس بمعنی دیکھنا یعنی کسی دوسرے کے ہمراہ دیکھنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کانشنس انسان کی وہ قوت ہے جس کے ذریعہ سے وہ کسی فعل کو خدا کے ہمراہ دیکھتاہے۔ جس نگاہ سے خدا اس پر نظر کرتااسی نگاہ سے انسان بھی اس پر نظر کرتاہے۔ یہ خدا کی آواز ہے جو انسان کو بتادیتی ہے کہ فلاں کام جائز ہے اور فلاں کام ناجائز ہے۔ فلاں کام کو کرنا چاہیے اور فلاں کو نہ کرنا چاہیے۔ یہ خدا کی وہ باطنی شریعت ہے جو انسان کو یہ بتادیتی ہے کہ فلاں کام کا کرنا فرض ہے اور فلاں کا نہ کرنا واجب ہے۔ حیوان میں یہ قوت نہیں موجود ہے اس کے سارے کام عادتاً کئے جاتے ہیں اپنی نفس پروری کے لئے وہ کسی اعلیٰ قانون کا پابند نہیں وہ اپنی طبیعت کے تابع رہتے اور ہر کام کے کرنے میں اس کی پیروی کرتے ہیں اسی لئے ہم ان کے کام کو نہ نیک کام نہ بد کام کہتے ہیں۔

کانشنس نہ صرف انسان کے افعال پر حکم لگاتا ہے بلکہ وہ انسان کے ہر فعل کی نیت پر بھی حکم لگانے کا اختیار رکھتاہے ۔ کسی فعل کے نیک یا بد ہونے میں نیت کو بڑا دخل ہے کیونکہ یہ ہوسکتاہے کہ وہ کام جو بظاہر نیکی کی صورت رکھتاہو برُی نیت سے کیا جائے اوریوں برُا ٹھہرے اس کے متعلق ایک نہایت ہی دلچسپ پر مشکل سوال پیش کیا گیاہے اور جس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں وہ سوال یہ ہے کہ کانشنس کاآغاز کسی طرح ہوا۔ بعض کا جواب یہ ہے کہ کانشنس تعلیم کا بچہ ہے ان کے خیال میں اسی وجہ سے مختلف اوقات اور مختلف ممالک میں اس کے فیصلوں میں اختلاف پایا گیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ایک ہی کام وقت اور موقع اور ملک کے لحاظ سے جائز یاناجائزقرار دیا جاتاہے۔

پھر اس سوال کا یہ بھی جواب دیا گیاہے کہ کانشنس انسان کے دماغ کا بچہ ہے ان کا خیال ہے کہ عقل جس بات کو معقول بتاتی ہے اسی کا نشنس نیک بتاتا ہے وہ صرف عقل کے فیصلہ کو منظور کرلیتاہے مثلاً ان کے خیال میں دیانتداری خوب ہے کیونکہ عقل کے نزدیک مصلحت اسی میں ہے اور چونکہ اسی میں فائدہ ہے اس لئے ایسا کام واجب ہے۔

ان دوجوابوں کے علاوہ یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ یہ ایک خداداد قوت ہے جس سے خدا نے انسان کو مشرف کیا۔ اول انسان خدا کی صورت پر پیدا کیا گیا اور اس صورت میں نیک اور بد کی پہچان موجود تھی اسی پہچان کا نام کانشنس ہے۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اس خداداد کے عنقریب سب قائل ہیں گو اس کے آغاز کی بابت اختلاف ہے۔ اس بیان کے علاوہ اس کے متعلق ایک اور امر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ کانشنس میں ایک طرح کی خرابی آگئی ہے اس خرابی کو مذہب کی اصطلاح میں گناہ کہتے ہیں۔ اس نے ہماری اس قوت کو کمزور کردیا اس کے باعث خدا کی آواز صاف طور سے ہمارے کان میں نہیں آتی اوراس لئے ہم نیکی کے باب میں غلطی کرتے ہیں بعض انسان میں تو یہ خرابی اس درجہ کی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ نیک کو بد اور بد کو نیک تصور کرنے لگتے ہیں ان کی تمیز مردہ ہوگئی ہے اس کا علاج کیا ہے ؟ دین ہی کا کام ہے کہ اس خرابی کو دفع کرے اور کانشنس کی اس کمزوری اور نقص کو رفع کرے۔ دین اور اخلاق کا تعلق یہاں سے صاف ہے۔ اس کے دفعیہ کی صورت یوں ہی ہے۔

دوم۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ دین نے اخلاق کے باب میں شریعت کا خیال پیدا کیا اوراس کو دو طور سے ظاہر کیا اور اول کانشنس اب اس کی دوسری صورت کو بیان کرتے ہیں۔ کانشنس شریعت کی باطنی صورت ہے وہ انسان کے دل میں پایا جاتا ہے پر اس دلی شریعت کے علاوہ دین سے ہم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ خدا نے شریعت کے اصل اصول کو انسان کی معرفت کے لئے تحریر کرایا اور یوں ایک مستقل طور سے اس کو ایسی ہدایت دی کی جس میں شک اور نقص کی گنجائش نہیں پائی جاتی ہے۔ اس کو ہم تحریری شریعت قرار دے سکتے ہیں۔ اخلاق کے متعلق جو تحریری شریعت آئی" اس کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں انسان کے ہر فعل کا ذکر نہیں کیا گیا پر اخلاق کا اصول قائم کیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے ہم انسان کے ہر فعل کے نیک یا بد ہونے کی جانچ کرسکتے ہیں یہی تحریری شریعت کی بڑی خوبی ہے جو ہر اخلاقی فعل پر حاوی ہے۔ یہ تحریری شریعت خدا تعالیٰ نے موسیٰ کی معرفت دی اور دیگر انبیاء نے بھی اس کا ذکر کیا اور لوگوں کو اس کی اطلاع کی پر یہ صرف موسیٰ اوراس کے لوگوں ہی پر محدود نہیں رکھی گئی بلکہ وہ صرف محض ایک آلہ تھی جسکے ذریعہ خداوند کا علم تمام دنیا میں پھیلا۔

۲۔ دین نے نہ صرف اخلاق کا ایک نیا تصور پیدا کیا بلکہ اس نے اس کا ایک ایسا اعلیٰ بیان پیش کیا کہ جو انسان کے فہم سے بہت ہی بزرگتر ہے۔ دین نے ہمیں یہ بتاتا کہ یہ شریعت فی الحقیقت خدا تعالیٰ کی ذات کا ظہور ہے۔ اس خیال کے موافق نیکی کا معیار نہایت ہی اعلیٰ معیار ہے۔ کوئی فعل کیوں نیک ہے؟ کیا اس لئے کہ اس سے فائدہ یا نفع ہوتا ہے ؟ کیا اس لئے کہ اس سے راحت ملتی ہے؟ کیا اس لئے کہ خدا تعالیٰ کی یہی مرضی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں ! صرف وہی فعل نیک ہے جو خدا کی ذات پاک سے موافقت رکھتا ہے جو نیکی کی ازلی شریعت کے مطابق ہے۔

پس ظاہر ہے کہ اخلاقی شریعت کی بنا ایسے قانون پر مبنی ہے جو موقع یا مصلحت کے خیال سے نہیں ٹھہرائے گئے بلکہ اس کی بنا ذات پاک پروردگار ہے اسی لئے یہ امتیاز ازلی ہے اور اخلاقی شریعت بھی ازلی شریعت پر موقوف ہے۔

اخلاق کا اسلامی فوٹو۔ اس سلسلہ میں ہم اخلاق کا اسلامی بیان بغیر کئے رہ نہیں سکتے۔ اسلام کی تعلیم کے موافق نیکی کی بنا کیا ہے؟ اگر ایک جملہ میں اس کا جواب دیاجائے تو وہ یوں ہوگا" بادشاہ کے دل کی موج" خدا عظیم الشان سلطان ہے اور وہ اپنے عرش پر سے جس فعل کو چاہے نیک قرار دے سکتا اور جب چاہے اس کو بد ٹھہرا سکتا ہے۔ یہ اسکی خوشی اور مرضی پر موقوف ہے اسی وجہ سے وہ نیکی اور بدی دونوں کا بانی قرار پایا ہے۔ اگر نیکی کے اس قیاس کو ہم صحیح مان لیں تو نیکی صرف موقع اور مصلحت کے اعتبار سے نیکی کہلائیگی اور وہ کام جو کسی وقت نیک کہکر مانا گیا ہے بد ٹھہر کر ممنوع ہوجائیگا اور جو بد قرار پایا ہے نیک تصور کیا جاکر تعمیل کے لائق ہوگا۔ اخلاق کے اسی قیاس نے اسلام میں کثرت الزدواج اور طلاق اور غلامی کو بہت ہی رواج دیا ہے۔ اخلاق کے اسی خیال نے حضرت محمد صاحب کو قسم توڑنے سے باز نہیں رکھا اور متنبیٰ بیٹے کی جورو سے عقد کرلینا بھی جائز کردیا اسی خیال نے اسلام کے پیروں پر صرف چار بیویاں نکاح میں جائز نہ رکھیں پر بنی کو اس قید سے آزاد کردیا۔ اسی خیال نے حضرت محمد صاحب کو جنگ کرنے پر آمادہ کیا اور لوٹ کے مال لینے اور تقسیم کرنے سے نہیں روکا!

اخلاق کے اس اصول نے اسلام میں ایک خوفناک عقیدہ بھی رائج کردیا یہ تنسیخ کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کے موافق خدا تعالیٰ اپنے اگلے احکام کو بدلتا رہتا ہے مثلاً کسی وقت وہ حکم دیتا ہے کہ نماز پڑھتے وقت یروشلیم کی طرف رخ کرو پر پھر اس حکم کو منسوخ کردیتا ہے اور یہ فرماتا ہے کہ اب آگے کو مکہ تمہارا قبلہ ہوگا یوں ہی شروع میں دین کے باب میں اس نے یہ فرمایا کہ ہر شخص اپنے دین پر رہے پھر جب محمد صاحب کا اختیار بڑھ گیا تو یہ حکم آیا کہ منافقوں سے جہاد کرو۔ تنسیخ کے مسئلہ نے محمدیوں کے دل میں بھی یہ جمادیا ہے کہ زبور کےآنے سے توریت اورانجیل کے آنے سے توریت اور زبور اورانجیل تینوں کتب منسوخ ہوگئیں اب ان کے پڑھنے اوران پر عمل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن ان سب کتب کا ناسخ ہے اس لئے وہی کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمدی صاحبان توریت اور زبور اورانجیل کو کلام اللہ مانتے ہیں پر نہ نماز کے وقت مسجد میں اور نہ ماہ رمضان میں یا اور کسی دیگر اوقات پر ان کو پڑھتے ہیں۔ کوئی اسلامی مدرسہ آپ کو نہ نظر آئیگا جہاں ان کتب کی تعلیم ہوتی ہو۔ یہ مسئلہ اسی خیال کا بچہ ہے کہ خداوند تعالیٰ حاکم ہے اور جب وہ چاہے اپنے احکام کو رد کرسکتا ہے اوران کو بدل کر دوسرا احکام جاری کرسکتا ہے۔ برعکس اس کے مسیحی یہ یقین کرتے ہیں کہ خداکے احکام اس کی پاک ذات کے ظاہر کرنے والے ہیں اس لئے لاتبدیل ہیں۔ چونکہ اس کی ذات غیر متغیر ہے۔ اس لئے اخلاق کے قوانین اور شریعت الہیٰ بھی غیر متغرین ہیں۔ اس

لئے سیدنا مسیح کا قول ہے کہ " آسمان اور زمین ٹل جائیں گے پر میری باتیں ہر گز نہیں ٹلینگی"۔

۳۔ مسیحی اخلاقی ۔ مسیحی دین نے اخلاق کے تصور میں ایک نئی زندگی ڈال دی ہے ۔ ہم بہت ہی اختصار سے اس کا ذکر یہاں مندرج کرتے ہیں۔

ا ۔ نہایت ہی غور طلب امر یہ ہے کہ مسیحی دین نے اخلاق کی فہرست میں چند ایسی خوبیاں پیوست کردی ہیں جن کا جلوہ اس وقت کی بے دینی کو منور کررہا ہے۔ ان میں سے ایک ایمان ہے۔ ایمان۔ اس لفظ میں کئی ایک باتوں کا خیال موجود ہے۔ ایمان کا ذکر بمقابلہ انسانی عقل اورہدایت کے آیا ہے مثلاً ایک رسول نے یہ بیان کیا کہ ہم ایمان پر چلتے ہیں نہ کہ آنکھوں دیکھے پر" اس سے ظاہر ہے کہ اس عالم کی روش کے لئے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ عقل سے دیکھ بھال کے ہم اس دنیا میں چلتے ہیں پر عالم نظریات سے علیحدہ ایک نادیدہ عالم بھی ہے اس سے بھی انسان کا تعلق ہے۔ وہ ذریعہ جس سے یہ تعلق انسان پیدا کرتاہے ہماری عقل نہیں ہے پر ہمارا ایمان ہے۔ اسی کے وسیلے ہم خدا سے تعلق پیدا کرسکتے ہیں اوراس کی باتوں کا یقین حاصل کرتے ہیں۔ دین اور فلسفہ کے باب میں ہم یہ دکھاآئے ہیں کہ انسانی عقل دین کے ہر معملہ کو حل کرنے پر قادر نہیں ہے اوراس لئے ایمان کی ضرورت ہے پھر انجیل میں لفظ ایمان بمقابلہ " اعمال" کے آیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی نجات اعمال سے نہیں پر ایمان سے ہے اور انسان کے اعمال گناہ آلودہ ہیں اوراس لئے نجات کے سبب نہیں ہوسکتے ہیں۔ نیک اعمال صرف خدا کی روح کی تحریک سے ہوتے ہیں اور نجات کے نتیجہ ہیں۔ نجات کے پانے کی امید پر وہ نہیں کئے جاتے پر نجات یافتہ کی پہچان کے ذریعہ ہیں۔

ب۔ پاکیزگی۔ دنیا کے سارے مذہب میں کم وبیش ناجائز کام سے پرہیز کرنے کا ذکر ملتاہے پر اکثر لوگوں نے ماددی غلاظت سے بری رہنے کا نام پاکی رکھاہے۔ یہ خیال عموماً مشرقی مذہب کا رہا ہے کیونکہ اس کے نزدیک مادہ ناپاکی کا سبب اور بدی کی جڑہے اس لئے ہندوں نے اشنان کو مذہبی رسم قرار دیا اوریہودیوں سے سیکھ کر اسلام نے طہارت کو دین میں جگہ دی۔دین مسیحی نے اس خیال کو بالکل صاف کردیا۔ اس میں پاکیزگی ماددی غلاظت سے ظاہر ہونے کا نام نہیں پر قلب کا گناہ اور ناراستی سے پاک ہونا پاکیزگی ہے۔ پاکیزگی محض اخلاقی بات ہے ۔ دیگر مذاہب میں ماددی غلاظت سے پاک ہونا دینی پاکیزگی ہے پر دین عیسوی میں انسان کے اخلاق کا خدا سا ہونا پاکیزگی ہے۔" تم پاک بنو جیسا میں پاک ہوں"۔یہی خدا تعالیٰ کا فرمان ہے۔جو بائبل میں آیا ہے۔

ج۔ محبت۔ مسیحی اخلاق کا مرکز محبت ہے۔ اس کو نفس الاخلاق کہئے تو بیجا نہیں۔ سارے نیک اعمال کی جان یہی ہے۔ یہی اخلاق کی اصل ہے یا جیسا انجیل میں آیا ہے۔" محبت شریعت کی تکمیل ہے" سیدنا مسیح سے جب یہ سوال کیا گیاکہ شریعت میں سب سے بڑا حکم کون سا ہے توآپ نے یہ جواب دیا کہ " خداوند اپنےخدا سے اپنے سارے دل اوراپنی ساری جان اوراپنی ساری عقل سے

محبت رکھو۔ بڑااور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ"۔

لفظ محبت قابل غور ہے ۔ یونانی زبان میں اس کو " اگاپے" کہتے ہیں اور انگلینڈ کے دارالعلم کی ایک عالم یہ قول ہے کہ " یہ لفظ یونانی فلسفہ میں نہیں پایا جاتاہے بلکہ اس کی پیدائش دین مسیحی کی گود میں ہوئی ہے سچ ہے کہ مسیحی دین نے محبت کو ساری نیکی کی اصل قرار دیا اوراس کو بمقابلہ اوراخلاقی خوبیوں کے شرف عطا کیا ۔ دنیا کی تہذیب کے اوپر اس کا اثر بہت ہی بڑا پڑا۔ افلاطون نے اخلاقی خوبیوں کی فہرست میں دوستی کا ذکر توضرور کیا ہے اورارسطاطالیس نے بھی فیلیا یعنی دوستی کا بیان کیا ہے پر یہ انجیل کے بیان سے جومحبت کے باب میں نہایت ہی ادنی ہے ۔ ستویقیون نے بھی اس پر بڑی تاکید کی پر جب ہم ان کی تاکید کی اور باتوں پر غور کرتے ہیں تو ان کا بیان انجیلی بیان کے آگے پھیکا معلوم پڑتاہے۔

سیدنا مسیح کے قول میں جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے دو باتیں نہایت ہی صاف ہیں۔ اول خدا سے محبت ۔ دوم انسان سے محبت۔

اول ۔خدا سے محبت ۔ مسیح کا فرمانا ہے کہ ساری نیکی اسی پر منحصر ہے اگر کوئی اس پر عمل کرے تو وہ ساری شریعت پر عمل کرتاہے ۔ سیدنا مسیح کے قبل یہودیوں میں اخلاق کے باب میں یہ بیان آیا تھا کہ خدا کا خوف دانائی کا شروع ہے پر انجیل نے دہشت کو دفع کردیا اور محبت کو پیدا کردیا ۔

قرآن نے بھی اسی یہودی خیال کی پیروی کی ۔ اس لئے اس میں بار بار لوگوں کو جہنم کے عذاب سے خوف دلایا ہے اور ڈرا کر خدا کے مطیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب اول مرتبہ میں نے قرآن کو پڑھا تو یہی بات اس میں مجھ کو بڑی بھاری اور خاص معلوم ہوئی کیونکہ اس کا ذکر بتکرار میرے سامنے آتا رہا اورمجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں کوئی غلام ہوں اور اس لئے مجھے خوف اور دہشت سے خدا کے آگے تھر تھرانا چاہیے۔

اخلاق کے قرانی اورانجیلی تصورمیں یہی بڑا فرق ہے ۔ مسیحی کیوں گناہ کو ترک کرتاہے ؟ کیا اس لئے کہ جہنم میں اس کو بڑی تکلیف ہوگی ؟ کیا اس لئے کہ اسے ابدلاآباد آگ میں جلنا ہوگا ؟ نہیں ۔ وہ گناہ کے جہنم کے خوف اور سزا کے ڈر سے نہیں چھوڑتا بلکہ اس سے کہیں بہتر اور عمدہ خیال سے وہ گناہ کو ترک کرتاہے ۔ وہ خدا سے محبت رکھتاہے اس لئے گناہ سے نفرت کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ اگر میں گناہ کرونگا تو خدا کو میری اس حرکت سے رنج ہوگا اوراس لئے خدا کی محبت کے باعث وہ گناہ سے باز آتاہے ۔ وہ غلام نہیں ہے اوراس لئے مار کے ڈراور کوڑے کھانے سے وہ لاپرواہ ہے پر وہ خدا کا فرزند ہے اوراس لئے محبت سے اپنے باپ کی اطاعت کرتاہے وہ جانتا ہے کہ اگر میں اپنے باپ کے احکام کی پیروی نہ کرونگا تواسکی محبت میں رخنہ پڑجائیگا۔

نیکی کی بابت بھی اس نفس الاخلاق محبت کے اصول نے نیکی کا کیسا اعلیٰ معیار ہمیں دکھایا ہے جتنے اعمال خدا کی محبت سے کئے جاتے ہیں۔ سوہی نیک

ہیں اگر کوئی شخص جاننا چاہتاہے کہ میرا فلاں عمل نیک ہے یا نہیں تو اس کو اپنے دل سے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ کیا وہ کام خدا کی محبت سے کیا گیا ہے یا کسی اور غرض سے۔ اگر خدا کی محبت سے کیا گیا ہے تو نیک ہے ور نہ نہیں۔ انجیل کا بیان ہے کہ " **خدا محبت ہے** " اوراس لئے نیکی وہی ہے جو ذات الہیٰ سے موافقت رکھتی ہواوروہی کام نیک ہیں جو الہیٰ محبت کے لحاظ سے کئے گئے ہیں۔

دوم۔ انسان سے محبت ۔سیدنا مسیح نے جب یہ تعلیم دی کہ خدا کو اپنے سارے دل سے پیار کرنا چاہیے تو اس کے ہمراہ یہ بھی سکھایا کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ۔ غور کا مقام ہے کہ یہ محبت انسیت اور مروت سے بڑھ کر ہے۔ انسان ایک دوسرے سے اکثر ملاجلا کرتا ہے اور بہت سے کام مروت سے کرتاہے پر یہ ہوسکتاہے کہ باہمی اختلاط ہو اور پھر بھی محبت ندارد!

پر اس باہمی محبت میں ایک اور بات شامل ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھنا اوراپنے دشمن سے عداوت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو اوراپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو تاکہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے ٹھہرو کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتاہے کیونکہ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہو تو تمہارے لئے کیا اجر ہے؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے ؟ اخلاق کا کمال اسی کا نام ہے ۔ قرآن کےورقوں میں ہم نے اس کمال کی تلاش کی پر نہ پایا۔ ویدوں میں اسے ڈھونڈھا پر نہ ملا۔ اس اخلاق کے اصول نے دنیا کو برادری کے بندھن سے باندھنے کا ذمہ اٹھایا ہے۔ صرف اس تعلیم کے ذریعہ جات پات کا جھگڑا دین ہنود میں سے جاتا رہیگا براہمن اور چھتری اور ویش اور شدر کا امتیاز جو بڑی برائیاں پیدا کررہا ہے صرف سیدنا مسیح کی اس تعلیم ہی سے دفع ہوسکتاہے۔

سیدنا مسیح نے نہ صرف اخلاق کا کمال اپنی تعلیم ہی کے ذریعہ بتایا بلکہ اس کمال کو عملاً بھی کردکھایا۔ ایک موقع کا ذکر کرنا اس کے ثبوت میں کافی ہوگا جس وقت سیدنا مسیح کو لوگ صلیب دیتے تھے انہوں نے اپنے دشمنوں کے لئے دعا کی اور فرمایا کہ اے باپ ! ان کو معاف کر کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ کیا کرتے ہیں ان کی تعلیم تھی کہ اپنے ستانے والوں کے لئے دعا کرو۔ اس موقعہ پر آپ نے اس تعلیم کی تعمیل بھی کردکھائی ہمیں اس بیان کے متعلق حضرت محمد ﷺ کا گوسنا یاد آتا ہے جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے ۔ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ مَا أَغْنَى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ (ترجمہ ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹیں ۔ سورۃ لہب) یہ وہ سورہ ہے جس میں محمد ﷺ اپنے چچا ابولہت اوراس کی بیوی کو خوب دل بھر کے صلواتیں سناتے ہیں۔ اے مسلم ۔ کیا سیدنا مسیح میں کوئی ایسی بات بتائے ہے؟

اسمیں کوئی شک نہیں کہ محبت کا بیان جیسا انجیل میں آیا ہے اور کسی دینی کتب میں نہیں ملتاہے۔ ہم سیدنا مسیح کے رسول پولوس کا بیان جو اس نے محبت کی شان میں فرمایا ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

اگر میں آدمیوں اور فرشتوں کی زبانیں بولوں اور محبت نہ کروں تو میں ٹھنٹھناتا پیتل یا جھنجھاتی جھانجھ ہوں۔ اور اگر مجھے نبوت ملے اور سب بھیدوں اور کل علم کی واقفیت ہو اور میرا ایمان یہاں تک کامل ہو کہ پہاڑوں کو ہٹادوں اور محبت نہ رکھو تومیں کچھ بھی نہیں۔ اور اگر اپنا سارا مال غریبوں کو کھلادوں یا اپنا بدن جلانے کو دے دوں اور محبت نہ رکھوں تومجھے کچھ بھی فائدہ نہیں۔ محبت صابر ہے اورمہربان۔ محبت حسد نہیں کرتی۔ محبت شیخی نہیں مارتی اورپھولتی نہیں۔نازیبا کام نہیں کرتی۔ اپنی بہتری نہیں چاہتی۔ جھنجھلاتی نہیں۔ بدگمانی نہیں کرتی۔ بدکاری سے خوش نہیں ہوتی بلکہ سچائی سے خوش ہوتی ہے۔ سب کچھ سہہ لیتی ہے۔ سب کچھ یقین کرتی ہے۔ سب باتوں کی امید رکھتی ہے۔ سب باتوں کی برداشت کرتی ہے۔

سب کچھ سہہ لیتی ہے۔ سب کچھ یقین کرتی ہے۔ سب باتوں کی امید رکھتی ہے۔ سب باتوں کی برداشت کرتی ہے۔ محبت کو زوال نہیں، نبوتیں ہوں تو موقوف ہوجائیں گی۔زبانیں ہوں تو جاتی رہیں گی۔ علم ہو تو مٹ جائے گا۔ کیونکہ ہمارا علم ناقص ہے اورہماری نبوت ناتمام۔ لیکن جب کامل آئیں گا تو ناقص جاتا رہے گا۔ جب میں بچہ تھا تو بچوں کی طرح بولتا تھا۔ بچوں کی سی طبعیت تھی۔ بچوں کی سی سمجھ تھی۔ لیکن جب جوان ہوا تو بچپن باتیں ترک کردیں۔ اب ہم کو آئینہ میں دھندلاسا دکھائی دیتاہے مگر اس وقت روبرو دیکھیں گے۔ اس وقت میرا علم ناقص ہے مگر اس وقت ایسے پورے طور پر پہچانوں گا جیسے میں پہچانا گیا ہوں۔ غرض ایمان، امید محبت یہ تینوں دائمی ہیں مگر افضل ان میں محبت ہے۔

باب سوم

دین کی ماہیت

دنیامیں بہت سے ادیان رائج ہیں۔ ان کا رواج بڑھتا بھی جاتاہے۔ نئے نئے مذہب ادھر اُدھر پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ لوگوں کو دین کا خیال ضرور ہے پر اسکے ساتھ ہی یہ بھی روشن ہے کہ عموماً لوگوں کو دین کا صحیح مفہوم معلوم نہیں ہے اور اس لئے وہ نئے نئے مذاہب ایجاد کرتے اوران سے اپنی تسلی کیا چاہتے ہیں بات یہ ہے کہ لوگ اس سے ناواقف ہیں کہ دین ہے کیا اس سے مراد کیا ہے۔اسکی خاصیت کیاہے؟

مروجہ ادیان پر جب ہم سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ان کی تفصیل کئی طور پر کی جاتی ہے پروفیسر مکس ملر نے ان کی تقسیم دو طرح پر کی ہے۔اول وہ مذاہب جنکی بنا کسی کتاب پر ہے۔ دوم۔ وہ مذاہب جن کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس سے ایک فائدہ مقصود ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن ادیان کی بنا کسی کتاب پر ہے انکی تحقیق آسانی سے ہوسکتی ہے اور ہم صداقت یا بطالت پر بسہولت حکم لگاسکتے ہیں پر جن مذاہب کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے ان کے نسبت فیصلہ کرنا

دشوار امر ہے۔ انکی وقفیت صرف ہم کو سیاحوں کی معرفت ہوتی اور اکثر ان حضرات کے بیانات میں اختلاف رہا کرتاہے۔

بعض ارباب دانش نے ادیان کی تفصیل بہ اعتبار قوم کے کی ہے اور یوں دنیا کے سارے مذہب کو یا تو شامی یا اریانی قرار دیاہے۔ ان دواقسام کے مذہب میں کچھ توموافقت اور کچھ تو مخالفت بھی دکھائی گئی ہیں مثلاً شامی مذہب میں خدا کے سلطان ہونے کا خیال بڑی تاکید سے آیا ہے۔ وہ ایل ہے وہ اللہ ہے اریانی دین نے اس بات پر تاکید کی کہ انسان اور خدا کے مابین مشابہت ہے اور اس مشابہت کو یہاں تک طول دیا کہ انسان کو خدا ٹھہرایا اورانسانی خرابیاں اور برائیاں بھی اس سے منسوب کردیں جس کا نتیجہ بت پرستی اور شیطان پرستی ہوا اس بات کے خیال رکھنے سے دین عیسوی کی بڑی خوبی نظر آتی ہے۔ دین عیسوی اپنے آغاز کے اعتبار سے شامی تو ہے پر اس میں شامی دینی نقص معدوم ہے پر دینی خوبی موجود ہے۔ نیز یہ بھی کہ وہ شروع میں شامی ہے پر بھی اریانی پر حمل کرتاہے اوراس طور اریانی نقص کو معدوم کرتااور اس کی خوبی کو قائم رکھتاہے۔ اس کی پوری بحث ہم آگے چل کر مسئلہ خدا کے باب میں تحریر کرینگے۔اس موقع پر صرف اتنا کہہ چھوڑتے ہیں کہ اگر یہ بیان صحیح ماناجائے تو دین کا صحیح اور کامل تصور صرف دین مسیحی سے حاصل ہوتاہے۔

دین کیا ہے؟ اس سوال کا جواب کئی طور پر دیا گیا ہے ۔ عاشقین دین کی خاطر چند کا ذکر بیان کرتے ہیں ۔ بعض نے علم کا نام دین رکھا ہے۔ ہم نے باب اول میں اس مضمون پر بحث کی ہے اور وہاں دین اور فلسفہ کا تعلق دکھایا ہے۔ پھر بعض نے مثل مشہور فلاسفر کینٹ کے دین کو اخلاق قرار دیا ہے۔اس پر بھی ہم نے اس رسالہ کے باب دوم میں بحث کی ہے ۔ نامی شیلرماخرنے فرمایا کہ دین نہ توعلم ہے نہ تو عمل ہے پر ہماری آرزو کا میلان ہے جو خدا کی اطاعت سے ظاہر ہوتاہے۔ فلاسفر ہیگل کا قول ہے کہ " دین یا توکامل آزادی ہے یا ہونی چاہیے" دین محدود روح کا وہ علم ہے جس سے وہ اپنی ماہیت کی روح مطلق کی سی سمجھتا ہے" الہیٰ روح محدود روح کے ذریعہ اپنے سے واقف ہوتی ہے"پرنسپل کیرڈ نے اپنی کتاب فلاسفی آف ریلیجن میں دین کی تعریف یوں کی ہے " دین محدود مرضی کا لامحدود مرضی کے مطیع ہوجاتاہے اپنی ساری شخصی خواہش اورارادہ کا ترک کرنا ہے اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے ساتھ بالکل متحدہ کردینا ہے" مشہور فیشٹ (Fishte) نے یہ بیان کیا کہ " دین اخلاق کی زندہ قوت ہے جس کا ہمیشہ اخلاقی اعمال سے ہوتاہے " ۔ سپنوزہ نے دین کو " عشق الہیٰ بتایا ہے جو خدا کے کمال کے عرفان پر مبنی ہے " گویتھہ نے دین کو سہ گنا ادب سے تعبیر کیا ہے اور یہ فرمایا کہ " جو کچھ اوپر ہے اس کا ادب اور جو کچھ گرد ہے اس کاادب اور جو کچھ نیچے ہے اس کا ادب دین میں داخل ہے" پروفیسر مکس ملر کے قول سے ہم ان اقوال کو ختم کرتے ہیں "۔ ان کا بیان یہ ہے " دین لامحدود کے اس ادراک کا نام ہے جس سے انسان کی اخلاقی سیرت بنتی ہے اس کے موافق مارٹن Martineau نے اپنی کتاب دی اسٹیڈی آف ریلیجن میں دین کا بیان کیا ہے کہ وہ زندہ خدا کا یقین

ہے ۔ یعنی الہیٰ دماغ اورارادہ کا یقین جو دنیا پر حکومت کرتا اورانسان سے اخلاقی تعلق رکھتاہے ۔ بیشک دین کا یہ تصور بہت ہی بزرگتر اورخوب ترہے۔ بہت سی تعریف سے جو دین کے باب میں آئی یہ ہی بہتر نظر آتاہے۔

ان جوابات سے قطع نظر کرکے اب ہم دین کے ان اجزا کا بیان چاہتے ہیں جو خاص ہیں اور جو دین کی خاصیت میں داخل ہیں اور جن سے دین کا تصور پیدا ہوتاہے ۔ ان کی تفصیل یوں ہے۔

۱ ۔ دین کی اول خاصیت اطاعت ہے ۔ انسان اپنے کو کسی بزرگ کے زیر حکومت سمجھتا اوراس کی اطاعت کا قائل ہوتاہے۔وہ اپنے کو محتاج جانتا ہے اوراس لئے اپنے سے کسی اعلیٰ وجود کا امیدوار ہوتاہے۔ مذہب کے پرانے قصے اس خاصیت کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ وید کے منتروں میں اس لئے ایسی دعائیں پائی جاتی ہیں جن میں پرستار بارش عمدہ کھیتی۔ دولت۔ گائے بیل کی کثرت کے لئے دیوتاؤں سے استدعا کرتے ہیں اور یہ دیوتے سورج اور چاند اور آگ اور پانی اور ہوا اور طوفان ہیں کیونکہ ان ہی پر لوگوں کی پرورش موقوف ہے۔

اطاعت کا خیال ان لوگوں میں بھی ہے جو ناخواندہ اور وحشی اقوام ہیں ان کی پرستش کے طریقے اس امر کے شاہد ہیں کہ وہ اپنے سے کسی بزرگ کا خوف رکھتے اوراس کے لئے اس کے مطیع ہوتے ہیں۔مثلاً ذولو اور گونڈ ودو وحشی قوم کی بابت یہ بیان پایا جاتاہے کہ جب ذولو قربانی چڑھاتا ہے تو یوں دعا کرتاہے ۔ اے فلاں مجھ پر رحم کر۔مجھے تندرست جسم عطا فرما تاکہ میں آرام سے زندگی گذرانوں۔

یونہی جس وقت گونڈدیوی کو انسان کی قربانی گذارنتاہے تو اپنے معبود سے یوں مخاطب ہوتاہے" اپنے جانوروں اور غلہ سے ہم نے تیرے لئے قربانی چڑھائی تو اب ہمیں غنی کر۔ ہمارے غلے اتنے ہوں کہ مکانوں میں رکھنے کی جگہ نہ ہو ہم نادان ہیں اور نہیں جانتے کہ کون سی اچھی چیز مانگیں توہی جانتا ہے کہ کیا خوب ہے وہ ہمیں عطا کر"۔

یونانی مذہب میں بھی اطاعت کا خیال پایا جاتاہے۔ اس کااشارہ بقول گلیڈسٹن صاحب اس عبارت میں موجود ہے "ہیمیس یعنی اخلاقی ادراک اور ایدوس یعنی عزت کا خیال اورالہوں کے خوف کی اندرونی تحریک" اس مقام سے بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنے معبودوں سے خوفزدہ ہو کر اس کی اطاعت پر آمادہ ہوتے تھے۔

دین موسوی سے بھی دین کے اس جز کی تشریح ہوسکتی ہے اس دین میں خدا کا اول تصور جو پیدا ہے وہ ایل شدائی کے نام سے ظاہر ہے اس نام کے معنی خدائے قادر ہے پھر دوسرا نام یہوواہ ہے جس کے معنی واجب الوجود ہے ایک تیسرا نام بھی خدا کا جو یہودیوں میں بہت رائج ہے وہ یہوواہ صبات یعنی رب الافواج ہے۔ ان تین مبارک ناموں میں دین کے سارے اجزا موجود ہیں چنانچہ اول نام ایل شدای سے اطاعت کا خیال روشن ہے باقی دو اور ناموں سے دین کے ان ارکان کا پتالگتاہے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کرینگے۔

۲ ۔مذہب کی دوسری خاصیت رفاقت ہے ۔ افلاطون نے دین کے باب میں یہ فرمایا ہے کہ انسان اور اللہ میں موافقت ہے اوراس موافقت پر خدا سے

رفاقت رکھنی مبنی ہے اسی کا نام دین ہے۔ اس خیال کی پیروی ہند کے رشیوں اورمنیوں نے انتہا درجہ کی حتیٰ کہ رفاقت کی فراغ میں خدا اور خود کی تمیز کو محو کردیا اور خود خدا میں محو ہوگئے۔ اس کا نام ویدانت مذہب ہے جو دین کی خاصیت رفاقت کی بگاڑ کا بچہ ہے۔ یہ اس رفاقت کی بگڑی ہوئی صورت ہے عشق الہیٰ کی کیا بات ہے اگر عاشق معشوق میں محوہوجائے اور اپنے کو فنا کردے تو عشق ہی معدوم ہوجائیگا اور نتیجہ ہاتھ آکر بے ہاتھ ہوجائیگا یہ بڑا ابھاری لاعلاج نقص ہندومذہب کا ہے کیونکہ اس کے موافق مذہب کی غایت لین ہونا ہے اور یہ بے حس بے ارادہ ہوجانا ہے یعنی ایک لفظ میں یوں کہیں کہ معدوم ہوجانا ہے۔

پھر بھی ہم اس کے قائل ہیں کہ الہیٰ رفاقت کی صحیح صورت جو خاص اور بے نقص ہے وہ مذہب کا ایک خاص جز ہے۔ اس کا قدیم طریقہ قربانی کا عالمگیر رواج تھا انسان قربانی کے ذریعہ سے خدا کی رفاقت اور قربت کا عاشق رہا اور اس طریق سے اپنے معبود کی نزدیکی تلاش کرتا تھا۔ ہم اس موقعہ پر مذہب کی دینی کتابوں سے قربانی کے عالمگیر ہونے کا ثبوت نہیں دیا چاہتے ہیں پر صرف اس قدرکہہ چھوڑتے ہیں کہ ہندو اور مصری اوریہودی اور دیگر مذاہب میں اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے۔ جب ہم مسئلہ کفار پر بحث کرینگے اس وقت اس کی تحقیق پورے طورسے کی جائیگی۔

۳۔ مذہب کی تیسری خاصیت ترقی ہے۔ اس خاصیت کا ذکر انگلستان کے مشہور اسقوف کارپنٹر صاحب نے اپنی کتاب **دی پرمیمننٹ لیمنٹس آف ریلیجن** میں کیا ہے۔اس موقعہ پر ان کا بیان نقل کرنا مناسب معلوم پڑتا ہے آپ فرماتے ہیں کہ خلقت آگے بڑھتی جارہی ہے اور ذاتی روحانی ترقی کا یقین مذہب کی اس خاصیت سے ظاہر ہوتاہے کہ زمانہ کا دور جو آگے کو ترقی کررہا ہے اس امر کو ثابت کرتاہے ہم اپنے فائدہ کے لئے نہیں پر ایک ایسے زمانہ کے لئے زندگی بسر کررہے ہیں جبکہ اس ایام کے فرزند ہمیں مبارک کہینگے ۔ ترقی کا خیال خوشی کے خیال کےشامل حال ہے۔ خوشی کی تلاش سبھوں کو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اپنی ساری لیاقت سے کام لیتے رہتے ہیں اوریہی ترقی ہے۔ اگر ترقی مذہب کی خاصیت میں داخل نہیں تو انسان کے لئے کارآمد بھی نہیں ہوسکتی ہے کیونکہ انسان ترقی کرتا جاتا ہے اور اگر مذہب میں یہ بات نہ پائی جائے تو وہ انسان کے کس کام کا ہوگا؟ بعض لوگوں نے تو ترقی ہی کا نام مذہب رکھاہے پر ہم صرف اس کے قائل ہیں کہ وہ مذہب کا ایک جز ہے۔ قوم کی ترقی اس کے ایک فرد کی ترقی کے مثل ہے جو لڑکے سے جوان اورجوانی سے قد آدم کو پہنچتاہے ۔ جب وہ لڑکا تب وہ محتاج ہے۔ یہ اس کی اطاعت کا زمانہ ہے۔ جب وہ جوان ہوتاہے تب وہ اپنے والد کے ساتھ اٹھتا بیٹھتاہے۔ یہ اس کی رفاقت کا زمانہ ہے جب وہ قدِ آدم کو پہنچتا ہے تب خود اپنے لئے فکر کرتا اور عقل دوڑاتاہے اور کام کرتاہے ۔ یہ اس کی ترقی کا زمانہ ہے۔ اسی طور سے دین میں اطاعت اور رفاقت اور ترقی یعنی ہر تین کا ہونا ضروری ہے۔

غور کامقام ہے کہ وہ دین جس میں صرف اطاعت پائی جائے ناقص دین ہے کیونکہ محض اطاعت سے انسان کمزور اور حریص بن جاتاہے وہ اپنا ہی خیال کرتاہے ۔ اس کو اپنی احتیاج کی فکر پڑی رہتی ہے۔ وہ اپنے کو دوسرے کا محتاج جانتا اوراس لئے دبا پڑا رہتاہے۔ اس دبے پڑے رہنے سے قوم کا بڑا نقصان ہوتاہے کیونکہ اس سے زندگی میں سعی اور کوشش کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اورعبادت میں روحانی رفاقت کی کوئی نوبت نہیں پہنچتی ! عبادت رسم پرستی ہوجاتی اورمذہب تعصب کا گھر بن جاتاہے !!

پھر یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ وہ دین جس میں صرف رفاقت ہی رفاقت پائی جائے ناقص دین ہوگا کیونکہ رفاقت اطاعت کے بغیر ہمہ اوست تک انسان کو لے جاتی ہے ۔جس کا نتیجہ یہ ہوتاہے کہ انسان عبادت ہی نہیں کرسکتا کیونکہ ہمہ اوست کے عقیدہ کے موافق عابد اور معبود کافرق جاتا رہتاہے ۔ علی ہذا القیاس رفاقت بغیر ترقی کے ایک قسم کی مذہبی عیش وعشرت ٹھہرتی ہے۔ عابد اپنے معبود سے ملنے کی دھن میں اپنے سارے فرائض سے لاپرواہ ہوجاتاہے۔ عاشق اپنے معشوق کے عشق میں تارک الدنیا ہو بیٹھتا اور اپنے ابنائے جنس کے حقوق کو ادا نہیں کرتا۔ وہ ترقی کی طبیعت کو کھو بیٹھتا ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ دین کی ماہیت میں اطاعت اور رفاقت اور ترقی ہر تین کی ضرورت ہے۔ ان میں سے کسی کو ہم دین کے اصلی تصور سے خالی نہیں کرسکتے اوراگر کسی دین میں مذہب کی ان تین خاصیت میں کوئی بھی ایسی ہو جو نہ پائی جائے تو ہمیں اس دین کے ناقص ہونے میں کوئی کلام نہیں رہیگا۔

دین مسیحی کا خاصہ۔ اس بحث کے آخر میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دین عیسوی کی ماہیت میں مذہب کی وہ تینوں خاصیت موجود ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ یہ بات دین مسیحی کے بانی کی زندگی اوراسکی تعلیم سے ظاہر ہے اس دین کا بانی سیدنا مسیح ہے۔ اس کی ساری زندگی خدا کی اطاعت اور رفاقت میں بسر کی گئی ۔ وہ خدا کو اپنا باپ جانتا ہے اور اس سے صاف ظاہر ہے وہ نہ صرف اس کی اطاعت کرتا بلکہ اس سے محبت اور رفاقت بھی رکھتاہے وہ اور لوگوں کو بھی یہی تعلیم دیتاہے کہ وہ خدا کو اپنا باپ جانیں اور اسی پر بھروسہ رکھیں۔ سیدنا مسیح کے اس وعظ میں جس کا ذکر مقدس متی رسول نے کیاہے یہ بات بخوبی ملتی ہے۔ انجیل متی کے ۶ باب کی ۲۶ تا ۳۲ آیات میں یوں مرقوم ہے کہ اپنی جان کے لئے فکر مت کرو کہ ہم کیا کھائینگے یا کیا پینگے نہ اپنے بدن کے لئے کہ کیا پہینینگے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بہتر نہیں الخ سیدنا مسیح نے خود اپنی بابت یہ فرمایا کہ میں آسمان سے اس لئے نہیں اترا کہ اپنی مرضی کے موافق عمل کروں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق (یوحنا کی انجیل ۶ باب ۳۸ آیت)۔

رفاقت کے باب سیدنا مسیح نے یہ تعلیم دی کہ انسان گو زمین سے بنایا گیا پر پھر بھی خدا اس کا باپ ہے اوراس لئے خدا کے ساتھ رفاقت رکھنی بہت ہی ممکن ہے ۔ گناہ کے باعث اس رفاقت میں رخنہ پڑگیا اور مسیح کے آنے کی غرض

یہی تھی کہ لوگ خدا کی رفاقت کے قابل ہوجائیں۔ اس نے ان کے لئے یہی دعا کی کہ " وہ سب ایک ہوں یعنی جس طرح اے باپ تو مجھ میں اور میں تجھ میں ہوں وہ بھی ہم میں ہوں (یوحنا ۱۷ باب ۲۱ آیت)۔

مذہب کی تیسری خاصیت ترقی کے باب میں سیدنا مسیح کا ایک قول پیش کرنا کافی ہوگا۔ آپ نے یہ فرمایا کہ " تم کامل بنو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے"۔ (متی کی ۵ باب ۴۸ آیت) اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ دین میں ترقی کے ہونے کی ضرورت ہے ۔ کمال بغیر ترقی کے محال ہے۔ ترقی بغیر کمال کے ناممکن ہے ۔ دین مسیحی جس کمال کو پیش کرتاہے وہ حددرجہ کا کمال ہے۔ وہ الہیٰ کمال ہے اوراس کوہم بغیر ترقی کے حاصل نہیں کرسکتے۔

دین میں عہد کا خیال۔ ہم نے اب تک دین کی ماہیت کی بحث میں ان اجزا کا ذکر کیا جو کم وبیش ہر مذہب میں کسی درجہ تک پائے جاتے ہیں۔ بعض مذاہب ایسے بھی ہیں جن میں صرف ادھ ایک جز پایا جاتاہے اور باقی کا پتہ نہیں لگتا۔ مسیحی دین میں تینوں اجزا موجود ہیں ہاں ان کے علاوہ دین عیسوی نے مذہب کے تصور میں ایک اور خیال پیدا کردیا ہے۔ اس کو ہم عہد کا خیال کہتے ہیں۔مذہب کا یہ تصور بالکل ہی نرالاہے۔ یہ خیال نہ تو اسلام اور نہ دین ہنود میں پایا جاتاہے ۔ اس کا ذکر صرف توریت اور زبور اورانجیل میں ہے۔ اس کا بیان مختصراً یوں ہے۔ خدا نے حقیقی مذہب کی پہچان کی اشاعت کے لئے ایک شخص کو چن لیا اس کا نام ابراہیم تھا۔ اس سے خدا نے فرمایا کہ میں خدا قادر ہوں تو میرے حضور چل اور کام ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے بہت بڑھاؤنگا ۔ دیکھ میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائیگا بلکہ ابراہیم ہوگا کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ بنایا اورمیں تجھے بہت برومند کرتا ہوں اور قومیں تجھ سے پیدا ہونگی اور بادشاہ تجھ سے نکلیں گے اورمیں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پشت درپشت کے لئے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد کرتا ہوں کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہوگا۔خداوند تعالیٰ کا یہ آخری جملہ قابل توجہ ہے " لہیوت لک لالوھیم والذرعک اخریک میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہونگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس برکت کا وعدہ خدا ابراہیم سے کرتاہے وہ نہ صرف دنیاوی برکت ہے بلکہ حقیقی مذہب کی برکت ہے ۔ اس کا وعدہ ہے کہ میں تیرا خدا ہونگا یعنی میں تیرے ساتھ خاص تعلق پیدا کرونگا۔ تجھے اپنی حقیقی پہچان عطا کرونگا اور تو مجھ کو اپنا خدا جانے گا یہاں سے واضح ہے کہ مذہب کیا ہے؟ وہ اس تعلق کا نام جو خدا اورانسان سے پیدا کرتا ہے جس میں اطاعت اور رفاقت اور ترقی کے علاوہ عہد کا خیال پایا جاتاہے کیونکہ عہد کے ذریعہ سے اطاعت اور رفاقت اور ترقی کو استحکام ہوتاہے۔

ایک اور بات قابل غور ہے ۔ ابراہیم کے دو بیٹے تھے ایک منکوحہ بیوی سارہ سے اور دوسرا ہاجرہ لونڈی سے ۔ سارہ کے بیٹے کا نام اضحاق اورہاجرہ کے بیٹے کا نام اسماعیل تھا۔اب امر غور طلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنا عہد اضحاق سے باندھتا

ہے اوراس موقع پر اسماعیل کو برطرف کردیتاہے۔ موسیٰ نبی نے اس کا بیان یوں کیاہے ۔ اور ابراہیم نے خدا سے کہا کاش کہ اسماعیل تیرے حضور جیتارہے تب خدا نے کہا کہ بیشک تیری جورو تیرے لئے ایک بیٹا جنیگی تو اس کا نام اضحاق رکھنا اور میں اس سے اور بعد اس کے اسکی اولاد سے اپنا عہد جو دائمی عہد ہے قائم کرونگا اور اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دونگا اور اسے برومند کرونگا اوراسے بہت بڑھاؤ نگا اوراس سے بارہ سردار پیدا ہونگے اور میں اسے بڑی قوم بناؤنگا لیکن میں اضحاق سے جس کو سارہ دوسرے سال اسی وقت معین پر جنیگی اپنا عہد قائم کرونگا (کتاب پیدائش ۱۷ باب ۱۸ آیت سے ۲۱ تک) یہاں سے ظاہر ہے کہ خدا نے اسماعیل کو دنیاوی برکت دی پردین کی برکت سے اضحاق ہی کو مستفیض کیا اوراس ہی کے ساتھ اپنا عہد قائم کیا۔ حسب فرمان خدا تعالیٰ الہٰی عرفان کا نور اضحاق اوراس کے خاندان میں چمکتا رہا۔ رسول اور نبی ان ہی میں سے معبوث ہوتے رہے الہام اورمکاشفہ ان کو ہوتا رہا حتیٰ کہ دین کا کامل کرنے والا سیدنا مسیح جو خدا کا اعلیٰ مکاشفہ اور اکمل الہام ہے ان ہی میں سے پیدا ہوا۔

یہ بات اہل اسلام کے غور کے قابل ہے کیونکہ وہ اسماعیل کی داد دیتے اور اس کو اسی عہد میں شامل کیا چاہتے ہیں پر موسیٰ کا بیان اس بات کی مطلق تائید نہیں کرتا ہے اس موقعہ پر عہد کے نشان ختنہ کا ذکر کرنا نامناسب معلوم ہوتاہے کیونکہ محمدی صاحبان اسے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ ختنہ ۔ اسکے متعلق کئی باتیں غور طلب ہیں اول۔ یہ کہ جب خدا نے ابراہیم سے عہد کیا تو اس عہد کے بعد اس رسم کو عہد کا نشان ٹھہرایا۔ دوم ختنہ ۔ کی رسم کا رواج یہودیوں کے علاوہ اور قوموں میں بھی تھا مثلاً مصری اپناختنہ کراتے تھے پران کے مختون ہونے کے باعث وہ عہد میں شامل نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اسماعیل کا ختنہ بھی ہوا پر اس سے کسی طرح کا عہد نہیں کیا گیا اسی طرح اہل اسماعیل کا حال ہے وہ مختون تو ہیں پر مختون ہونے ہی سے عہد کے فرزند نہیں ٹھہرتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن میں ختنہ کا کوئی حکم نہیں آیا ہے اور حضرت محمد کا خود بھی ختنہ نہیں ہوا تھا۔ تعجب ہے کہ محمدی پھر کیونکہ اس رسم اس قدر فخر کرتے ہیں۔ سوم خدا نے موسیٰ نبی کے ذریعہ سے ختنہ کے حقیقی مطلب کو یوں واضح کردیاہے " اور خداوند تیرا خدا تیرے دل اور تیری نسل کے دل کا ختنہ کریگا تاکہ تو خداوند اپنے خدا کو اپنے دل اور اپنے سارے جی سے دوست رکھے اور جیتا رہے ۔(کتاب استثنا باب ۳۰ آیت ۶)۔

خداوند تعالیٰ نے اپنے اس عہد کو جو اس نے ابراہیم سے باندھا تھا کوہ سینا پر تمام امت سے باندھا۔ اس وقت اس نے بذریعہ موسیٰ کے تمام قوم کو شریعت دی ۔ یہ شریعت تین قسم کی تھی اول ملکی دوم رسمی سوم اخلاقی ۔ملکی شریعت میں ورثہ اورشادی اورطلاق اور والدین اور آقا او ر شوہراوربیوی کے اختیارات کا ذکر اورجائداد اور قرض اور سود اور دہ یکی وغیرہ کا بیان کیا گیا تھا۔رسمی شریعت میں عبادت کے رسوم اور قربانیوں کے قوانین اورحلال اور حرام کے

قاعدے مذکور تھے۔ اخلاقی شریعت میں خدا کے دس احکام تھے جو ملکی اور رسمی شریعت کی جان تھی۔ ملکی اور رسمی شریعت دینے کی غرض یہ تھی کہ خدا کی اُمت بُت پرستوں سے علیحدہ رہے اور پاکیزگی کے سبق سیکھے ۔ عموماً اہل اسلام اس بات کو فراموش کرتے ہیں اور اس لئے یہ گمان کرتے ہیں کہ توریت منسوخ ہوگئی پر ساری شریعت کی غایت توریت کے الفاظ میں یہ ہے کہ **تم پاک بنو جیسا میں پاک ہوں**۔ اسی لئے خدا نے حلال اور حرام اور طہارت اور نیز اسی قسم کی شریعت دی تاکہ لوگ پاک بننا سیکھیں اور جب خدا کی اُمت نے اس غائت کو فراموش کیا اور رسم ہی کو اصل اور مغز قرار دیا تو خدا نے پھر نئے عہد کا اعلان دیا جس کا ذکر یرمیاہ نبی کیا ہے۔

نیا عہد ۔ دیکھو وہ دن آتے ہیں خداوند کہتا ہے کہ میں اسرائیل کے گھرانے اور یہودہ کے گھرانے سے نیا عہد باندھونگا۔ اس عہد کے موافق نہیں جو میں نے ان کے باپ دادوں سے کیا جس دن میں نے ان کی دستگیری کی تاکہ زمین مصر سے انہیں نکال لاؤں اور انہوں نے میرے اس عہد کو توڑا اور میں نے انہیں ترک کردیا خداوند کہتا ہے۔ بلکہ یہ عہد جومیں اسرائیل کے گھرانے سے کرونگا ان دونوں کے بعد خداوند فرماتا ہے میں اپنی شریعت کو ان کے اندر رکھونگا اور ان کے دل پر اسے لکھونگا اور میں ان کا خدا ہونگا اور وہ میرے لوگ ہونگے۔ اور وہ پھر اپنے اپنے پڑوسی سے اور اپنے اپنے بھائی کو یہ کہکے نہ سکھائینگے کہ خداوند کو پہچانو کیونکہ چھوٹے سے بڑے تک وہ مجھے جانینگے خداوند کہتا ہے کہ میں ان کی بدکاری کو بخشدونگا اوران کے گناہ کو یاد نہ کرونگا" اس نئے عہد میں یہودیوں کے علاوہ دنیا کےسارے لوگوں کے شامل ہونے کا وعدہ خدانے نبیوں کے ذریعہ سے کیا چنانچہ یسعیاہ نبی نے بار بار اس کا ذکر کیا ہے کہ بیگانوں کی اولاد اور وہ لوگ بھی جو یہودی عہد میں شامل نہیں ہوسکتے تھے اس عہد میں داخل ہونگے کیونکہ میرا گھر ساری قوموں کی عبادتگاہ کہلائیگا "(یسعیاہ ۵۷ باب آیت ۷)۔ یہ بات سیدنا مسیح کے وسیلہ سے پوری ہوئی اور اسی لئے وہ نئے عہد کا رسول کہلاتا ہے۔ اس نے اپنی موت کے ذریعہ سے یہ عہد خدا اور جمیع انسان کے مابین قائم کیا اور اس لئے اس کا خون نئے عہد کا خون کہلاتا ہے ۔ اس کے وسیلہ سے سارے آدمی معافی پاتے اور خدا کے ساتھ تعلق پیدا کرتے اور عہد میں شامل ہوسکتے ہیں۔ دین اسی کا نام ہے۔

باب چہارم

دین اور قرآن

ان الذین عنه الله الاسلام " تحقیق دین نزدیک اللہ کے اسلام ہے" قرآن کا یہ دعویٰ تحقیق کے قابل ہے اور اس باب میں ہم دین کے اس تصور کو زیر بحث لایا چاہتے ہیں جس کو قرآن نے پیش کیا ہے"

محمدیوں کی تصنیفات میں تین الفاظ کا استعمال عموماً مروج ہے اول دین یہ نہایت ہی عام لفظ ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اللہ کے طریق کو دین کہتے ہیں پر قرآن میں اس کا اطلاق بت پرستوں کے مذہب پر بھی کیا گیا مثلاً یہ آیت آئی ہے

لکم ویںکم ولی دین۔ دوسرا لفظ مذہب ہے۔ یہ علماء اسلام اور دین کے امام
اور مجتہدین کے اعتبار سے مروج ہے مثلاً حنفی مذہب، تیسرا لفظ ملت ہے یہ لفظ
قرآن میں پندرہ مرتبہ آیا ہے کبھی اس سے دین ابراہیم اور کبھی انبیاء کا دین اور
کبھی بت پرستوں کا دین اور کبھی یہود اور نصاریٰ کا دین مراد ہے۔ اس لفظ کی
نسبت ایک محقق نے یوں تحریر کیا ہے کہ جب کبھی حضرت محمد صاحب ابراہیم
کے دین کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اس کو ملت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ زبان عربی
میں اس لفظ کے معنی آگ یا گرم راکھ کے ہیں اور مذہب کو ملت اس تاثیر کے اعتبار
سے کہتے ہیں جو مذہب سے متصور ہے ۔ پر چونکہ یہ تعبیر خوب نہیں نظر آتی
لہذاہمارے خیال میں یہ لفظ ملت عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ اصل میں یہ عبرانی
زبان کا لفظ ہے اوراس کے معنی کلام کے ہیں اور کلام سے مراد وہ تعلیم ہے جو
ابراہیم خدا کی نسبت دیتے تھے۔

اسلام۔ دین محمدی کا نام اسلام ہے۔ سید امیر علی صاحب اپنی مشہور
کتاب لائف اینڈ ٹیچینگ آف محمد میں اس لفظ کی شرع یوں کرتے ہیں۔ اسلام
لفظ مسلم سے بنا ہے اور سلم کے معنی اطمینان اورامن سے رہنا۔ اپنا فرض ادا کرنا
کامل سلامتی سے ہونا۔ اپنے تیئں اس کے بن سے صلح کی گئی ہو مطیع کردینا۔ وہ یہ
بھی فرماتے ہیں کہ اس لفظ سے جیسا عموماً خیال کیا جاتا ہے خدا کی مرضی کی اطاعت
مطلق مراد نہیں پر راستبازی کے لئے کوشاں ہونا مراد ہے۔ یہ سید امیر علی صاحب
کا بیان ہے اب قرآن کا بیان جو اس باب میں ہے وہ گوشگذار کیاجاتا ہے۔ سورہ آل
عمران ع ۹ ۔ تو کہہ کہ ہم خدا پر ایمان لائے اوراس پر جو ہم پر نازل ہوا اورجو
ابراہیم پر اور اسماعیل اور اضحاق اور یعقوب اوراس کے بارہ بیٹوں پر نازل ہوا تھا
اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اورسب نبیوں کو ان کے رب سے ملا تھا ہم ان میں کسی کو جدا
نہیں کرتے اورہم اس کے واسطے مسلمان ہیں۔ **ونحن لہ مسلمون**

دین محمدی اسلام ہے اوراسلام اطاعت کا نام ہے اوراس اطاعت میں
توحید اور صوم اور صلوۃ اور زکواۃ اورحج شامل ہیں۔ قرآن کادعویٰ ہے کہ ابراہیم
مسلم تھا۔ سورہ آل عمران آیت ۶۰ " ابراہیم نہ یہودی تھا نہ نصرانی لیکن وہ
حنیف مسلم تھا"۔ توریت سے ظاہر ہے کہ یہودیوں کی ابتدا حضرت ابراہیم سے
ہوئی جس کو قرآن مسلم بتاتا ہے اور اس لئے قرآن کی زیادہ باتیں یہودیوں کی سی
ہیں اور شروع میں حضرت محمد کا ارادہ بھی یہی نظر پڑتا ہے کہ وہ دین یہود کی توحید
اوران کے بزرگوں کے قصے سنا کر لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں اوران کو بھی اپنی
طرف مائل کریں پر کوئی بات ضرور ایسی ہوئی جس سے یہ مطلب نہ برآیا اوراس لئے
حضرت محمد نے اپنے ہی کو پہلا مسلمان بتایا دیکھو سورہ زمر آیت ۱۴ " توکہہ مجھے
حکم ملا کہ بخلوص دین اللہ کی عبادت کروں اورمجھے حکم ملا کہ پہلا مسلمان بنوں"۔

اسلام اطاعت ہے پر یہ اطاعت ایسے زبردست بادشاہ کی اطاعت ہے
جس کی مرضی فولاد کے موافق سخت ہے جس کے احکام بیقائدہ بھی اگرہوجائیں۔ تو
کیا مضائقہ ! اس بے قاعدگی اوربے اعتدالی کی ایک مثال اس موقعہ پر پیش
کرتاہوں اور وہ سورہ اعراف ع اور سورہ حج ع میں مذکور ہے۔" ہم نے انسان کو

سڑی کیچڑ کی کھنکھناتی مٹی سے بنایا ہے اورپہلے ہم جنات کو آتش سوز ان سے بنا چکے تھے اورجب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں ایک بشر سڑی کیچڑ کھنکھناتی متی سے بناؤ نگا جب میں اسے درست کرلوں اوراپنی روح اس میں پھونکدوں تم سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا پھر سب فرشتوں نے اسے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے ساجدین میں ہونے سے انکار کیا۔ فرمایا اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ توساجدین میں شامل نہ ہوا کہامیں ہر گز بشر کو سجدہ نہ کرو نگا تونے اسے سڑی کیچڑ کی کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔ فرمایا نکل جا تو مردود ہے تاروز انصاف تجھ پر لعنت ہے"۔ غور کا مقام ہے کہ قرآن میں بار بار بیان آیاہے کہ خدا کی سجدہ واجب ہے پر یہاں خدا خودایک بشر کے سجدہ کا حکم دیتا ہے اور جب اس حکم کی تعمیل نہیں ہوتی ہے کس قاعدہ سے بشر کا نہ پوجینوالا لعنتی ٹھہرتاہے۔ اسلام کا جواب یہ ہے کہ خدا کی آہنی مرضی کی اطاعت کی بیقاعدگی سے یہ ہوسکتا ہے! کیا یہ سچ نہیں کہ اسی قسم کی اطاعت کا نام اسلام ہے۔

۲۔ دین کی دوسری خاصیت جس کا ذکر باب ماسبق میں ہوچکا رفاقت ہے اس موقع پر یہ دریافت کرنا واجب ہے کہ کیا اسلام میں رفاقت کی گنجائش ہے۔ ہم افسوس کےساتھ یہ جواب دیتے ہیں کہ ازروئے اسلام خدا سے رفاقت رکھنی محال ہے۔ انسان ازروئے اسلام خدا کا مطیع ہوسکتاہے پراسکا رفیق نہیں ہوسکتا۔ وہ خدا کا بندہ ہوسکتاہے پر اس کا فرزند نہیں ہوسکتا۔ وہ اسکاغلام ہوسکتا پر اس کا بیٹا نہیں ہوسکتا ہے۔ پر انسانی طبیعت الہی شرکت اور رفاقت کے لئے ترستی ہے اوراس سے اسلام کے پیرو بھی خالی نہیں۔ اس طبیعت نے جب اسلام میں زور پکڑا تو دو طرح کی غلطی واقع ہوئی۔ چند مذہبی شخصوں نے ولیوں کی رفاقت اختیار کی۔ انکے اوصاف حمیدہ کے مداح ہوئے اور اگران کی حین حیات میں نہیں تو بعد وفات ان کے پرستار بنے اوران کی قبروں اور مزاروں کی زیارت کرنے لگے۔ اس رفاقت کی جستجو میں دوسری قسم کی غلطی اہل تصوف سے ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ اگر اسلام میں رفاقت کا خیال کہیں پایاجاتاہے تووہ تصوف میں پایا جاتاہے۔ اسکے نزدیک مذہب عشق کا نام ہے جس کی غائت وصل ہے پر افسوس صوفی وصل ہی پر کفایت نہیں کرتا پر فنافی اللہ میں مرجاتاہے۔

اس بیان سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اسلام میں الہیٰ رفاقت کا خیال پایا جاتاہے ہر گز نہیں۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ نہ تو ولیوں اورمزاروں کی پرستش سے اور نہ اہل تصوف سے اسلام کو دلچسپی ہے۔ یہ اسلام کے اجزا نہیں۔ اسلام ان کا ذمہ وار نہیں۔

۳۔ دین کی تیسری خاصیت ترقی ہے۔ کیا اسلام میں ترقی کی صورت ہے اس میں شک نہیں کہ اسلامی سلطنت نے علم اور ادب کو ترقی دی ہے۔ ایک ایسا زمانہ تھا جب یونانی اور سنسکرت کی کتابیں زبان عربی میں ترجمہ ہوئیں منصور اور ہارون الرشید اورالمامون سب علم دوست اور خلفاء تھے اس موقعہ پر ہمیں انوری کا ایک شعر یادآتاہے۔

خوشا نواحی بغداد جاے فضل وہنر
کہ کس نشان ندہد درجہا کشور
سواد و بمثل چون سپر مینار نگ
ہواے اور بصفت چون نسیم جان پرور

ہمیں اس بات کے اقرار کرنے میں کسی طرح کا عذر نہیں کہ نویں صدی سے لے کر بارہویں صدی تک اسلام میں علمی شغل بڑے زور شور سے جاری رہا بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا شوق اس امر میں اس زمانہ کے مسیحیوں سے بھی بڑھارہا پر تواریخ ہمیں یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ یہ شغل وجوش اسلام میں شروع ہی سے موجود نہیں تھا۔ جس وقت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی خلافت کرتے تھے اور جس ایام میں بنوامیہ کی حکومت تھی اس وقت علم کا بازار کسی طرح سے گرم نظر نہیں آتا اور نہ ترقی کی کوئی خواہش دیکھ پڑتی ہے۔ جب حکومت اور سلطنت اہل عرب سے منتقل ہو کر اہل فارس کے ہاتھ میں آگئی اس وقت اس بازار کا رنگ بدل گیا۔ جب العباسیہ خلافت کرنے لگے تو اسلام کے بڑے علماء الغرابی اور ابوسینہ اور احمد ابن راشد ظہور میں آئے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علم اور ادب کا یہ جوش اور مذاق اسلام میں اس وقت پیدا ہوا جب اسکا تعلق عرب سے جاتا رہا اور فارس سے پیدا ہوا اور وجہ اس کی بہت ہی صاف ہے۔ اہل عرب سے محروم اور شائستگی سے غیر مانوس شروع ہی سے تھے پر اہل فارس علم دوست اور صاحب فہم رہے اور اس لئے جب اسلام انکے ملک میں پہنچا تو ان کا اثر اس پر پڑا۔ ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ علمی ترقی اسلام کے طفیل سے نہیں پر اہل فارس کے طفیل سے اسلام میں آئی مذہبی امور میں بھی ترقی ودشوار بلکہ محال ہے۔ قرآن کی تعلیم جو تقدیر کے باب میں ہے ترقی کی جانی دشمن ہے۔ انا کل شئی خلقناہد بقدر۔ سورہ قمر ع فیضل اللہ من یشاء ویہدی من یشا روہوا العزیز الحکیم۔ سورہ ابراہیم ع ان آیات اور مثل ان کے اور آیات ہیں جن ظاہر ہے کہ تقدیر نے اسلام کو اسطرح گرفت کیا ہے کہ تدبیر کی گنجائش جاتی رہی۔ حدیثوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ خدا نے چند لوگوں کو فردوس اور چند لوگوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس تعلیم کا اثر اہل اسلام کے معاملات پر بھی نظر آتا ہے کہ کس قدر وہ جبر اور قدر کی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہی ہونا ہے۔ وہی ہوا !!! بھلا پھر ترقی کس طرح ہو سکتی ہے!

دین اورجہاد۔ قرآن نے دین کے ساتھ جہاد کو قائم کیا ہے۔ یہ بات بالکل نئی ہے ۔ کسی اور دین میں نہ دیکھی گئی اور نہ سنی گئی ہے۔ اکثر محمدی موسیٰ کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں اور جنگ موسیٰ اور یشوع نے بت پرستوں سے کی اور اس کو جہاد قرار دیتے ہیں ۔ اس کی بطالت جہاد کے صحیح بیان سے ظاہر ہوجائیگی اور نیز حضرت محمد ﷺ کی اس ساری کارروائی سے جو اس معاملہ میں ہوئی وہو ہذا۔

عور کا مقام ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی سوانح عمری کا زمانہ دو ہے۔ اول وہ ایام جو شہر مکہ میں گذرا۔ اس آیام میں انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے کو نظیر اور بشیر بتایا۔ بت پرستوں کو وعظ کیا اور جب وہ رجوع نہیں کرتے تھے تو یہ

فرمایا کہ لکم دینکم ولی دین یعنی تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے واسطے میرا دین
اچھا ہے۔ دوسرا زمانہ حضرت کا وہ ہے جو شہر مدینہ میں صرف ہوا۔ اس ایام میں
ان کا رنگ کچھ بدلنے لگا۔ یہاں آپ کے مددگار جو انصار کھلاتے ہیں نظر آنے لگے۔
پرانی عربی طبعیت نے جوش پکڑا اور اب دین کے نام سے تمام ملک عرب کے
فتح کرنے کا خیال دماغ میں سمایا۔ اب الاکراہ فی الدین یعنی دین میں زبردستی
نہیں۔ یہ تعلیم مصلحت سے خالی نظر آنے لگی اور قافلوں پر جو تجارت کی غرض سے
ادھر اُدھر سے آتے جاتے تھے حملے شروع کردئیے۔ مدینہ میں آئے ابھی بارہ ماہ کا
عرصہ نہ ہونے پایا تھا کہ حضرت محمد خود اہل قریش کے کارواں کی تلاش میں نکلے۔
کبھی مایوسی بھی ستاتی تھی کیونکہ خالی ہاتھ لوٹنا پڑتا تھا ! ابوا اور بوات اور اوشیرہ
کے حربوں کی یہی کیفیت ہے۔ نخلہ پر جو لڑائی ہوئی وہ اس لئے قابل ذکر ہے کہ
اس موقعہ پر حضرت محمد صاحب پر وحی اتری کہ ماہ رجب میں بھی جنگ وجدال جائز
ہے۔ دیکھو سور بقرہ ع ۲۷ " تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں قتال کیسا ہے۔
توکہہ ۔ اس میں قتال بڑا گناہ ہے پر خدا کی راہ سے پھر جانا اوراس کے ساتھ کفر ہے
اور اسکے اہل کاوہاں سے نکالنا خدا کے نزدیک اس سے بڑا گناہ ے اور فتنہ قتل سے
بڑا گناہ ہے ۔ جو ایمان لائے اور جنھوں نے حجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا وہی
اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشندہ مہربان ہے۔"

اب حضرت محمد ﷺ اوران کے پیروؤں کا عناد اور عتاب بڑھتا گیا
غنیمت کا مال ہاتھ لگنے لگا اوراس باب میں وحی پر وحی کا آنا آسان ہو گیا۔ ایک اور
آیت نازل ہوئی ۔ سورہ بقرہ ع ۲۴ ۔" اور خدا کی راہ ان سے لڑو جو تم سے لڑتے
ہیں اور زیادتی نہ کرو کیونکہ خدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جہاں کہیں
پاؤ ان کو قتل کرو اور وہاں سے ان کو نکال لو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔
(یعنی مکہ سے) الخ۔

وقتلوھم حتی لایکون فتنہ ویکون الدین اللہ

یعنی ان کو یہاں تک قتل کرو کہ فساد باقی نہ رہے اور دین خدا کا ہوجائے!
اب مذہبی بنا پر جنگ وجدل۔ کشت وخون اسلام میں جائز ہو گیا اور غرض اسکی
واضح طور سے بیان کردی گئی۔ ویکون الدین اللہ۔ **دین اللہ کا ہوجائے !!**

معلوم ہوتا ہے کہ مومنین میں ایسے لوگ بھی تھے جو لڑنے سے ڈرتے تھے
ان کے لئے سورہ محمد ع ۳ نازل ہوا"۔اور ایماندار کہتے تھے کہ (جہاد کے بارہ میں)
کوئی سورۃ کیوں نازل نہ کئی گئی ۔ پھر جب صاف معنی سورت نازل کی گئی اوراس
میں قتال کا ذکر آیا تو انہوں نے دیکھا جن کے دلوں میں مرض ہے کہ تیری طرف
یوں تکتے رہ گئے جیسے وہ تکتا ہے جسے موت کی بے ہوشی آتی ہے۔۔۔۔۔ جب حکم
جہاد مصمم ہوگیا اگر وہ اللہ سے سچ بولیں انکے لئے بہتر ہے"۔

ایک اور بات سنئیے۔ حضرت محمد ﷺ خود بھی لڑنے کو تیار تھے چنانچہ
جنگ بدر میں آپ اور ابوبکر ایک ساتھ ایک جھوپڑے میں رہے اور چونکہ دماغ
لڑائی بھڑائی کے خیال سے بھرا ہوا تھا خواب میں دشمن نظر آنے لگے اسی خواب کی
طرف سورہ انفال ع ۵ میں اشارہ ہے" اور جب تجھے اے محمد اللہ نے خواب میں

دکھلایا تھا کہ قریشی تھوڑے ہیں اگر وہ تجھے ان کی کثرت دکھلاتا تو تم نامردی کرتے اور کام میں جھگڑا ڈالتے لیکن اللہ نے تمہیں نامردی سے بچالیا اور وہ دلوں کو جانتاہے"۔

جنگ احد کا قصہ ہر کوئی جانتاہے۔ اس جنگ میں حضرت محمد ﷺ مسلح ہو کر لڑنے کو گئے۔ زرہ بکتر پہنے ہوئے ۔ تلوار اور سپر لگائے ہوئے حضرت نکلے پر افسوس مجروح ہوگئے۔ کسی نے ایک پتھر پھینک کر ان کا ایک دانت توڑڈالا اور آپکی پیشانی کو بھی زخمی کیا۔ افواہ یہ پھیل گئی کہ حضرت مرگئے پر طلحہ کے طفیل سے وہ پھر اپنے لوگوں پاس آئے اور وہاں ان زخم پٹی کی گئی اور یوں جان توبچ گئی !

ذرا وہ اصحاب جوحضرت محمد ﷺ کی جنگ کو موسیٰ نبی کی جنگ سے مقابلہ کرتے اور دونوں کو مساوی بتاتے ہیں اس موقعہ پر غور کریں اورخیال رکھیں کہ وہ جنگ جو خدا تعالیٰ کے لئے کی جاتی جنگ احد کے موافق نہیں ہوتی ہے۔ کیا نظارہ ہے؟ موسیٰ پہاڑ پر دعا کرتا۔ حضرت محمد ﷺ جنگ میں تلوار چلاتے موسیٰ اپنے معمولی نبی کی پوشاک میں ہے۔ حضرت محمد مسلح ہیں۔ موسیٰ دعا کے ذریعہ فتح پاتاہے۔ حضرت محمد مسلح ہو کر بھی مجروح ہوجاتے ! اس موقع پر محمد ﷺ کے ہمعصریہودیوں کا طعن جس کا ذکر محمدی مورخ واقیدی کرتا بیجا نہیں معلوم ہوتا وہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ کے موافق کبھی کسی سچے نبی نے جنگ میں شکست نہیں کھائی یا ذاتی نقصان اٹھایا۔ سچ تو یہ ہے کہ محمد بادشاہ ہوا چاہتا ہے !

اس ماجرے کا ذکر قرآن کے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران ع ۱۵ میں آیا ہے۔ شائقین ملاحظہ فرمائیں۔

اضرب عنقہہ ! حضرت محمد ﷺ کی سوانح عمری پر یہ ایک بڑا دھبا ہے کہ ان کے حکم سے کئی شخصوں کا گلا کاٹ ڈالا گیا۔ ادہ ایک اہم ذکر کرتے ہیں۔ اسمانیت مروان اسلام اور محمد ﷺ کی مذمت کیا کرتی تھی۔ جب یہ سورہی تھی توایک اندھے شخص نے اس کو جا کر تلوار سے مارا ڈالا اوراس کی تعریف محمد صاحب نے کی کہ یہ شخص خدا اوراس کے نبی کا مددگار ہے۔مدینہ میں یہ پہلا خون تھا جو محمد ﷺ کی رضا سے کیا گیا۔ پھر ایک شخص بنام نصر جنگ بدر میں قید کیا گیا تھا۔ جب سارے قیدی محمد ﷺ کے پاس لائے گئے تو انکی نگاہ اس شخص پر پڑی جس سے وہ تھرا اٹھا اور جان بخشی کے لئے عرض کی پر محمد ﷺ نے حکم دیا کہ اضرب عنقہہ یعنی گردن مارو اور یوں اس کا کام تمام ہوا۔

کعب ابن اشرف کا قصہ نہایت ہی دلسوز ہے۔ یہ شخص ایک یہودن کا لڑکا تھا۔ بدر کی لڑائی کے بعد اس نے اہلِ مکہ کو حضرت محمد کی طرف سے بدظن کرنا شروع کیا اورمدینہ میں آکروہاں کے رہنے والوں کو اپنے اشعار سے اشتعالک دیا۔ محمد صاحب اس سے تنگ آگئے۔ اب تو اس کی جان کی ٹھہری۔ قصہ کوتاہ آخرش محمد بن مسلمہ اور دیگر چار اشخاص نے اسے دھوکے سے مارڈالا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسجد کے پاس محمد ﷺ بڑے تپاک سے ان سے ملے اس وقت حضرت کا

چہرہ بڑا بشاش تھا۔قاتلوں نے مقتولوں کے سر کو محمد ﷺ کے قدموں پر ڈالدیا اورآپ نے تکبیر پڑھی۔

اے اسلام! آپکے نبی کی یہ حرکت کہاں تک زیبا ہے ؟ تو اس کی تعریف میں یوں گوہر افشاں ہوتاہے۔ بلغ العلیٰ بکمالہ۔ کشف الدجیٰ بجمالہ حسنت جمیع خصالہ ۔ صلوعلیہ ۔ پر ہمارے نزدیک یہ اسلام کی شان پر بڑا بھاری دھباہے جس کی تاویل کرنے میں جناب سید امیر علی صاحب بھی قاصر رہے گئے۔ہم نے اس موقع پر ان کی لائف آف محمد(محمد کی سوانح عمری) کو غور سے پڑھا پر سیری نہ ہوئی وائے برمن! دائے براسلام من !!

" فان اللہ خمسہ وللرسول"! قرآن اور حضرت محمد صاحب کی تواریخ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جنگ میں لوٹ مچتی تھی اور غنیمت کا مال بعد ختم لڑائی تقسیم ہوتا تھا اور خمس یعنی پانچواں حصہ محمد صاحب کو بھی ملتا تھا۔ غنیمت کی تقسیم میں کبھی جھگڑا پڑتا تھا چنانچہ جنگ بدر کی لوٹ کے مال کی تقسیم میں ایسا ہی ہوا۔ اس جھگڑے کے فیصلہ کےلئے وحی آنے کی نوبت ہوئی ۔ اس کا ذکر قرآن کے سورہ انفال میں پایا جاتاہے۔

لوٹ کے مال پانے کا شوق محمد ﷺ کے پیروؤں میں ایسا بڑھ گیا تھا کہ وہ لالچ کے مارے ان کو بھی مارڈالتے تھے جنہوں نے اہل اسلام کو قبول کرلیا تھا۔ یہ بات اس حد تک پہنچی تھی کہ اس خرابی کو دفع کرنیکے لئے قرآن کی ایک آیت اتری ۔ وہ یہ ہے " اے مسلمانوں جب تم خدا کی راہ میں (یعنی جہاد میں) سفر کرو توخوب دریافت کروجو کوئی تمہیں سلام علیک کہے اسے نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے (امن کے لئے سلام کرتاہے) کیا تم دنیا کی زندگی کے لئے یہ سامان کی تلاش میں ہو کہ اسے لوٹو۔خدا کے پاس لوٹ کے مال میں بہت ہیں۔ تم بھی پہلے ایسے ہی تھے (یعنی جان مال بچانے کو تم نے کلمہ پڑھ لیا تھا) پر اللہ نے تم پر فضل کیا"۔

ہم نے اس بیان کو جو دین اورجہاد کے باب میں ہے کسی قدر مفصل لکھاہے ۔وجہ اس کی یہ ہے کہ آج کل کے تعلیمیافتہ مسلمان جہاد کی تاویل کرتے اوراس کے محض لغوی معنی پر تاکید کرتے ہیں اور کشت وخون کا انکار کرتے ہیں حق تو یہ ہے کہ وہ جنگی روح نہیں رکھتے اوراس لئے جنگ وجدل کو حضرت محمد ﷺ سے منسوب نہیں کیا چاہتے ۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ بات بُری ہے اوراس لئے جہاد کے معنی صرف کوشش کے لیتے ہیں پر قرآن کا بیان اور دین اسلام کی تواریخ سے کچھ اورہی بوآرہی ہے ہماری ساری تقریر کا لب لباب جو اوپر کرآئے ہیں یہ ہے۔

۱ ۔ قرآن میں نہ صرف لفظ جہاد پر لفظ قتل بھی آیاہے۔

۲ ۔ حضرت محمد ﷺ بلاوجہ ہی حربے کرتے تھے۔

۳۔ حضرت محمد ﷺ خود ہتھیار بند جنگ میں جاتے اور لڑتے تھے۔

۴۔ حضرت محمد ﷺ کے اشتعالک سے کئی اشخاص قتل کئے گئے۔

۵ ۔ حضرت محمد ﷺ کولوٹ کا مال بھی ملتا تھا۔

۶ ۔ اس حرکت کی غایت یکون الدین اللہ تھی یعنی اللہ کے دین کا قیام۔

اے ناظرین ! قرآن اور دین کا بیان جیسا کچھ ہے ہم نے آپ کے گوش گذار کیا۔ قرآن کا دینی تصور یہی ہے اور ازروئے اسلام دین یہی ہے ۔ سیف اسلام کا خون قرآن اور تاریخ اسلام پر ایک بڑا دھبہ ہے۔ جس کو کوئی تاویل مٹا نہیں سکتی ہے۔ ہم حیرت میں ہیں کہ کیوں حضرت محمد کا مقابلہ سیدنا مسیح سے کیا جاتا ہے۔ کیوں جہاد کرنے والے اور جہاد کی ترغیب دینے والے کا مقابلہ سلامتی کے شاہزادہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہم سیدنا مسیح کے ایک قول سے اس باب کو ختم کرتے ہیں۔" **میری بادشاہت دنیا کی نہیں اگر میری بادشاہت دنیا کی ہوتی تو میرے خادم لڑتے تاکہ میں یہودیوں کے حوالہ نہ کیا جاؤں** "۔

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک !

حصّہ دوم

باب اوّل

خدا کی ذات وصفات

خدا کی ہستی دین کی بنیاد ہے ۔ دنیا کے جتنے مذاہب ہیں سب کے سب کسی اعلیٰ ہستی کے قائل ہیں۔ اسی کو واجب الوجود کہتے ہیں ۔ وہی خدا ہے جو دین کی بنیاد ہے۔ جب یہ حال ہے تو اس ہستی کی بدلائل عقلی قائم کرنا محض فضول ہے۔ علماء نے بطریق استدلال لمی وانی و نظام فطرت اور دیگر اعتبارات سے اس کا ثبوت دیا ہے پر میرے نزدیک اس کی ہستی اس قدر دلائل عقلیہ پر قائم نہیں ہے جس قدر ایمان پر۔ ہم ایمان سے اس بات کو قبول کرلیتے ہیں کہ خدا ہے۔ دلائل عقلیہ کی ضرورت محض ایمان کے استحکام کے لئے ہے۔

خدا نہ صرف ہے پر اس کا عرفان بھی ممکن ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کیونکہ آج کل ایسے خیال کے لوگ پیدا ہوئے ہیں جو اسکی ہستی کے تو قائل ہیں پر عرفان الہیٰ کے منکر ہیں۔ انکی رائے یہ ہے کہ ہم اس ہستی واجب الوجود کی نسبت کچھ بھی نہیں جان سکتے ہیں۔

اس رائے کی تردید میں ہمارا یہ کہنا ہے کہ عرفان الہیٰ کی قابلیت انسان میں موجود ہے خدا نے انسان اول کو اپنی صورت پر پیدا کیا تھا اور اس میں اپنے جاننے کا مادہ رکھا موسیٰ نے اس بات کا ذکر یوں کیا ہے"۔ تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اوراپنی مانند بنائیں کہ وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں پر اور مویشیوں پر اور تمام زمین پر اور سب کیڑے مکوڑوں پر جو زمین پر رینگتے ہیں سرداری کریں۔ اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔ نر اور ناری ان کو پیدا کیا۔ موسیٰ کا یہ بیان صاف ظاہر کرتاہے کہ انسان میں خدا کی پہچان کاملکہ موجود ہے۔

پھر جس طرح انسان میں خدا کے جاننے کاملکہ ہے اسی طرح خدا میں انسان کو اپنے عرفان عطا کرنے کی بھی قدرت ہے ۔ خدا بنی آدم پر اپنے تئیں ظاہر کرتا اوران کو اپنی مرضی بتاتا ہے ۔ اس امر میں بعض اشخاص بعض پر فضیلت رکھتے ہیں انہیں کو نبی یا خوزیح یا رویح کہتے ہیں جن پر خدا اپنے تیئں ظاہر کرتا اوران کو جمیع انسان کے لئے اپنے مکاشفہ کاآلہ بناتا ہے۔

التشبیہ (Anthropomorphism) خدا کا مکاشفہ جب انبیا کو ہوتاہے تووہ اس کے اپنے محاورات اوراصطلاحات میں ادا کرتے ہیں نفس مضمون اور مغز کلام خدا کی طرف سے ان کی ارواح پر کشف کردیا جاتااور اس کو وہ اپنے طرز کلام اور طرز عبارت میں پیش کرتے تھے کیونکہ یہ توظاہر ہے کہ اگر خدا اس طریق کو اختیار نہیں کرتا تو انسان اس کی بابت مطلق نہیں جانتا اس معنی میں توریت اور زبور اور کتب انبیاء اورانجیل میں خدا کے ہاتھ اور چہرہ اورمنہ اورآنکھ کا ذکر آتاہے۔

اس تقریر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کو خدا کا علم کسی حد اوردرجہ تک ہوتاہے ۔ جس قدر خدا اپنے تئیں ظاہر فرماتاہے اسی قدر انسان اس کو پہچانتاہے ۔ اس سے زیادہ وہ اس کو جان نہیں سکتاہے۔ پر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ خدا کی بابت جاہل مطلق ہے اور نہ یہ کہ جو کچھ وہ جانتاہے سو صحیح نہیں ہے۔

بتدریج۔ یہ امر نہایت ہی غور طلب ہے کہ خدا نے اپنا مکاشفہ بتدریج دیا چنانچہ ایک رسول نے فرمایا ہے کہ" خدا جس نے اگلے زمانہ میں نبیوں کی معرفت باپ دادوں سے حصہ بہ حصہ اورطرح بہ طرح کلام کیا اس زمانہ کے اخیر میں ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا جسے اس نے ساری چیزوں کا وارث ٹھہرایا اور جس کے وسیلہ سے اس نے عالم پیدا کئے "۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ علم بتدریج حاصل ہوتاہے اور معلم متعلم کو سارے علوم کو یکبار گی نہیں بتادیتاہے۔ خدا نے ہماری تعلیم کے لئے یہی قاعدہ جاری رکھا اور اپنا علم حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح دیا۔ اس قاعدہ سے علم کی تحصیل میں سہولت بھی مقصود ہے کیونکہ اسی طریق سے انسان آسانی سے کسی بات کو سیکھ سکتاہے۔

اکمل مکاشفہ۔ رسول کا قول مذکورہ بالا یہ بتاتاہے کہ شروع میں خدا نے انبیاء دانہ کئے اوران کے ذریعہ سے اپنا علم دنیامیں پھیلایا۔ بعد وہ اپنے بیٹے کو بھیجا اوراس کے ذریعہ سے جمیع انسان کو اس حد تک علم عطا کیا جہاں تک وہ جان سکتے

اورجہاں تک ان کے لئے اس کا جاننا ضرور تھا۔ پس خدا کی ذات اور صفات کا وہ مکاشفہ جو سیدنا مسیح کے ذریعہ سے دنیا کو دیا گیا اکمل مکاشفہ ہے۔ اس امر کی تشریح کے لئے اگرہم قوم یہود کی دینی کتب کی طرف رجوع کریں توخوب ہوگا۔ ان کی کتاب توریت میں خدا کا اول اور ابتدای تصور موجود ہے۔ وہ خیال جو اس تصور سے مقصود ہے قدرت ہے۔ یہ خیال خدا کے ان اسماء سے ظاہر ہے جن کا استعمال اس کتاب میں ہوا ہے۔ وہ نام ایل اور الوہیم ہیں۔ ان سے الہیٰ قدرت متصور ہے۔ اہل سائنس کی اصطلاح میں فورس یہی ہے۔ یہ وہ قدرت ہے جومادہ کو حرکت دیتی اورصورت بخشی ہے۔ یہ وہ قدرت ہے جو انسان کے افعال کی ہدایت کرتی۔ پھر وہ محض قدرت ہی نہیں پر صاحبِ قدرت ہے۔ وہ ایسا وجود ہے جس میں ارادہ اور عقل بھی موجود ہیں۔

خدا کی شان میں ایک اور لفظ توریت میں آیا ہے۔ وہ ایل شدائی کہلاتا ہے لفظ شد کے معنی ہلاکت ہے اوراس سے خدا کا رعب اور غضب ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے دشمن کوہلاک کرتا اوراپنے حبیبوں کورہائی دیتا ہے۔

انکے علاوہ خدا اپنے تئیں موسیٰ پر ایک نئے نام سے ظاہر کرتا ہے۔ وہ نام خدا کا اسم ذات ہے۔ اس کا ذکر یوں ہے کہ جس وقت موسیٰ نبی ہونے کے لئے مبعوث ہو خدا نے اس کو بلایا تا کہ وہ فرعون پاس جائے پر موسیٰ نے خدا کو کہا میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکالوں۔ خدا نے فرمایا کہ یقیناً میں تیرے ساتھ ہونگا۔ تب موسیٰ نے خدا سے پوچھا کہ دیکھ جب میں بنی اسرائیل پاس پہنچوں اورانہیں کہوں کہ تمہارے باپ دادوں کے خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اوروہ مجھے کہیں کہ اس کا نام کیا ہے تومیں انہیں کیا بتاؤں خدا نے موسیٰ کو کہا کہ اھیہ اشیر اھیہ یعنی میں وہ ہوں جو میں ہوں اور اس نے کہا کہ تو بنی اسرائیل سے کہیو کہ وہ جو ہے اس نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے تو بنی اسرائیل سے یوں کہیو کہ خداوند تمہارے باپ کے خدا ابراہیم کے خدا اور اضحاق کے خدا اور یعقوب کے خدا نے مجھے تم پاس بھیجا ہے ابد تک میرا یہی نام ہے۔ پھر خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ انی یہوواہ میں یہوواہ ہوں اورمیں نے ابراہیم اور اضحاق اور یعقوب پر ایل شدائی کے نام سے اپنے تئیں ظاہر کیا اوریہوواہ کے نام سے ان پرظاہر نہیں ہوا۔ (خروج کی کتاب باب ۳ ۱ آیت۔ ۱۱ تا ۱۵۔ اور باب ۶آیت ۲ تا ۳)غور کا مقام ہے کہ اس نئے مکاشفہ نے خدا کی بابت ایک نئی بات بتائی یعنی یہ کہ خدافقط قدرت اور حرکت اورزبردست قوت ہی نہیں پرازلی اصلی واجب الوجود ہے جوساری وجود کامنبع ہے۔

"اھیہ اشیراھیہ" ، " میں جوں ہوں" وہ ہے نہ کہ ہوا۔ وہ ہے یعنی اس کی نسبت ہمیشہ ہے کہنا ہی روا ہے کیونکہ وہ ابد تک رہتا ہے۔

مذہب کے عالم میں خدا کا تصور جو پیدا کیا گیا ہے قابل ذکر ہے اور اس کا بیان دوقیاس پر مستعمل ہے۔ ان کو ہم اس موقع پر مختصراً گوش گذار کرتے ہیں۔

اول۔ قیاس تفریق۔ اس قیاس کے عاشق خدا اور کائنات میں حددرجہ کا فاصلہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں خدا دنیا سے علیحدہٗ ہے اور نہ صرف علیحدہ

ہی ہے بلکہ اس سے بالکل لاپرواہ ہے۔وہ اس کا خالق تو ہے پر بعد خلق کرنے کے وہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔اس کی مثال اس گھڑی ساز کی سی ہے جس نے گھڑی کے پرزے جوڑے اوران کو تیار کردیا پر جب گھڑی تیار ہو گئی توپھر وہ اس سے بے فکر ہو گیا۔اس کو پھر خبر نہیں کہ میری بنائی ہوئی گھڑی کہاں گئی اوراب کس حضرت کے پاس ہے۔ اس خیال کے پیروٴخدا کی شان میں بھی اسی قسم کی بات کہا کرتے ہیں خدا ہے۔ وہ خالق بھی ہے۔ پر اب دنیا کا انتظام قانون قدرت کے ہاتھ سونپ چکا ہے اوراس لئے اس کواب خدا کی کوئی ضرورت نہیں۔ سب کچھ قانون فطرت سے انجام پاتا۔ وہ تو کرنا تھا کرچکا اب عرش پربیٹھا ہے اور بس اس خیال میں تھوڑی سی ترمیم بھی ہوئی ہے۔ بعض کے خیال کے موافق خدا ہی توعرش پر اوراپنی خلقت سے دوررہتا ہے پر اپنی کارروائی کے لئے فرشتوں اورجنات کا محتاج ہے۔ انہیں کے ذریعہ سے دنیا کا کام نکالتا ہے پرخود بلاوساطت دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

تواریخ سے ظاہر ہے کہ سترھویں صدی میں اس خیال کا دور دورہ بڑی تیزی پر تھا۔ انگریزی زبان میں ڈی ازم اسی کا نام ہے۔ جب ہم اسلام کی تعلیم پر فکر کرتے ہیں تووہ بھی اسی قسم کی معلوم ہوتی ہے۔ بادی النظر دین یہودی اسی خیال سے مملو معلوم ہوتا ہے صرف فرق اتنا ہے کہ وہاں جنات کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

دوم۔ قیاس تقریب۔ کیا خوب ! خیال کے جھونکے نے جو پلٹا کھایا تو قیاس تفریق سے قیاس تقریب کی طرف رجوع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا اور خلقت کا فرق معدوم ہو گیا۔ وہ دونوں ایسے وصل ہوئے کہ ایک دوسرے میں محوہوگئے۔ اس لئے انہوں نے خدا کو برہم کہا یعنی ایسا وجود جو اپنے کو بڑھایا اور پھیلاسکتا ہوحتیٰ کہ خلقت کو بھی اپنے میں سمیٹ کرایک کرلیتا ہے فلسفہ کا مذہب یہی نظر آتا ہے ۔ یونان اورہندوفلسفہ بالخصوص ویدانت یہی ہے۔ سچ پوچھیئے تو خدا اس قیاس کے ماننے والوں کے نزدیک معبود نہیں ہوسکتا۔اس کی پرستش نہیں کی جاسکتی کیونکہ حقیقتاً نہ کوئی عابد ہے اور نہ کوئی معبود۔ خدا سارے اوصاف سے خالی ہوجاتا ہے اوراس لئے وہ نرگن کہلاتا ہے۔

اس موقع پر نجم البلاغت کاایک قول یاد آتا ہے۔ یہ اہل تشعیہ کے امام خلیفہ علی کا قول ہے جس پر سارے شیعہ گرویدہ ہیں۔ وہ قول یہ ہے۔ "وکمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ"۔آپ کا بیان یہ ہے کہ خدا سے کوئی انسانی صفت یا ایسی صفت جس کا خیال انسان کرسکتا ہو منسوب نہ کی جائے دینداری کا کمال خدا کوجاننا ہے اورعلم کاکمال اسکے موجود ہونے کا اثبات ہے اور اس کے موجودہ ہونے کا کمال اسکی وحدت کااقبال باخلاص ہے اوراس لئے اخلاص کا کمال اوصاف الہیٰ کو نفی ہے۔ یہ بیان بہت ہی انوکھا ہے اور ہندوؤں کے نرگن مذہب سے بالکل ملتاہوا ہے۔ بھلا اگر خدا کی ذات سے سارے اوصاف کی نفی کردی جائے توہم اسکا تصور کرسکتے ہیں اوراس کی شان میں کیاکہہ سکتے ہیں۔ اس کی ہستی عدم کے مساوی ہے

اور ایسا خدا نہ دین اور نہ دنیا کے کام کا ہے۔ وہ جو صفات سے خالی ہے موصوف نہیں ہوسکتا اور وہ جوموصوف نہیں ہوسکتا معبود نہیں قرار دیا جاتا اوروہ جو معبود نہیں مخلوق کے مطلب کا نہیں۔ نہ دین کو اس سے کوئی کام اور نہ دنیا کو فائدہ!

امر بین الامرین ۔ علماء نے یہ قاعدہ ٹھہرایا ہے کہ صداقت طریق اوسط میں پائی جاتی ہے اور یہ قاعدہ صحیح بھی نظر پڑتاہے لہذا اس مضمون کی صداقت ہر دو قیاس مذکورہ بالاکے مابین موجود ہے۔ اس کو ہم اس جگہ تحریر کرتے ہیں۔ انجیل میں یہ بیان تین صورت پر کیا گیاہے۔

ا ۔ خداروح ہے۔ خدا کی ذات کا یہ اظہار سیدنا مسیح سے کیا گیا اور یہ بیان مکاشفہ کے عالم میں لاثانی اوریکتا ہے۔ ہم مختصراً اس کی تشریح یہاں پر کرتے ہیں۔"خداروح ہے"۔ اس سے کیا مراد ہے؟

اس امر کو سمجھنے کے لئے یہ یادرکھنا چاہیے کہ موجودات کی تفصیل دوہی طرح پر ہوسکتی ہے یعنی روح اور مادہ ۔جتنی اشیاہیں سب کی سب یا توروح یا تومادہ کے زمرہ میں شامل ہیں۔ مادہ ھیولا کو کہتے ہیں اوراس میں وسعت اور عمق اور زن ہوتاہے اور وہ خود بخود حرکت نہیں کرتا بلکہ ساکن رہتاہے۔ روح میں حیات اور غور اورفکر کی قوت ہے۔ وہ خود کرتی اور مادہ کو حرکت دیتی ہے۔ اس میں ارادہ موجود ہے۔ مادہ کثیف پرروح لطیف ہے۔

خدا کی شان میں جب لفظ روح کا اطلاق کیا جاتا تو اس سے یہ مراد ہے کہ وہ مادہ کے عیوب سے پاک ہے۔ وسعت کی ضرورت اس کو نہیں ہے۔ وہ فاعل ذیہوش اور صاحب علم اورارادہ ہے۔ اس کی ذات لطیف ہے ۔پر اس کا ایک اور بھی باریک مفہوم ہے"۔ خداروح ہے"۔ اس سے نہ صرف یہ مراد ہے کہ اس کا وجودمادی یا ھیولانی نہیں پراس سے یہ بھی مقصود ہے کہ وہ محیط ہے۔وہ ذات لطیف ہر موجودات کو محصور کئے ہوئے ہےمادہ کا وجود بغیر اس کے وجود کے قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ اس کو سنبھالتا اوراس میں سکونت کرتاہے۔ یوں وہ اسکی حیات ہے ۔ وہ اس میں سرایت کئے ہوئے ہے اور پھر بھی اس سے محدود نہیں ہوجاتاہے۔

خدا کا یہ ذاتی تصور قیاس تفریق اور تقریب کے عیوب اور نقوص سے پاک اور ان کی خوبیوں سے ممتاز اور مشرف ہے۔ اس خیال کے موافق خلقت سے لاپروا اوردور نہیں ہے۔ وہ ایسا خدا نہیں ہے جو کہیں عالم غیب میں کسی تخت یا عرش پر بیٹھا ہواور صرف اس کا کوئی جلوہ اس دنیا تک پہنچا ہو۔ یہ تو اسلامی تصور ہے جس کا نقص بڑا بھاری یہ ہے کہ اس خیال کے موافق خدا کی ذات وسعت امکان کی محتاج ہوتی اوریوں محدود ٹھہرتی ہے ۔ مسیحی تصور اس عیب سے پاک ہے کیونکہ اس اعتبار سے خدا ہر وسعت میں سرایت کئے ہوئے اورپھر بھی اس سے محدود نہیں ہوجاتاہے کیونکہ وہ روح ہے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ خدا کا یہ مسیحی تصورویدانت یا قیاس تقریب کے نقص سے بری ہے۔ ویدانت فلسفہ نے مادہ کی گنجائش ہی مٹادی ہے جو کچھ ہے سو برھم ہی ہے۔ اس کے نزدیک صرف ایک ہی حقیقت اورایک ہی وجود

ہے۔وہ وجود برھم ہی کا ہے۔ باقی سب معدوم ہے۔ برخلاف اس قیاس کے مسیح نے تعلیم دی ہے کہ مادہ موجود ہے اورخدا بھی موجود ہے ۔ یہاں ایک فلسفانہ دقت پیدا ہوئی کہ اگر خدا اور مادہ دونوں موجود ہیں تو یا تو خدا مادہ سے محدود ہے یا اگر وہ لامحدود ہے تو مادہ معدوم ہے۔خدا کا مسیحانہ تصور اس دقت کو دفع کرتاہے کیونکہ اس کا کہنا یہ ہے کہ خدا مادہ میں سکونت اور سرایت کرتاہے۔ وہ اس سے محیط تونہیں پر اس کو محیط ہے وہ اس کی جان ہو کر اس کو قائم رکھتا اوراس لئے مادہ اور خداہر دور کی گنجائش بنی رہتی ہے۔

اس امر کا یاد رکھنا ازحد ضرور ہے کیونکہ یہ ایک بڑے راز کی مفتاح ہے وہ رازعظیم یہ ہے کہ خدا مادہ میں اور مادہ سے اپنے اوصاف کو ظاہر کرسکتا یا یوں کہیں کہ وہ مادی جسم کو اپنے ظہور کا آلہ بناسکتا ہے وہ انسانیت کو قبول کرسکتا اور گو جسم انسان کو اختیار کرتا پھر بھی وہ اس سے محدود نہیں ہوجاتاہے۔ اکثر محمدی علماء اس امر کو فراموش کردیتے اور سیدنا مسیح کی بابت یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا اگر وہ خدا تھا تو مادی انسانی جسم سے محدود نہیں ہوگیا؟ کیوں جناب ذرا غور تو فرمائیں۔خدا لامحدود اورمادہ موجودیعنی مادہ کا وجود خدا کو محدود نہیں کرتا علی ہذا القیاس مادی جسم کاوجودسیدنا مسیح کی خدائی کو بھی محدود نہیں کرتاہے۔

۲۔"خدا نور ہے" خدا کی ذات کا یہ بیان بھی سیدنا مسیح کے ذریعہ بنی آدم کو عطا ہوا۔ اس کی بابت یوحنا رسول نے یہ فرمایا کہ اس سے یعنی سیدنا مسیح سے سن کر جو پیغام تمہیں دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا نور ہے اور اس میں تاریکی ذرا بھی نہیں ہے (یوحنا کا پہلاخط باب اول آیت پانچ)"خدا نور ہے" اس سے کیا مراد ہے؟ اس کے معنی یہ ہر گز نہیں ہیں کہ خدا کوئی شعلہ یا آگ ہے بلکہ اس سے خاص دو باتیں ملحوظ ہیں۔ اول خدا کی سیرت کا بیان نور سے کیا گیاہے اوراس سیرت کا خاصہ اس کا قدس ہے۔ دیدنی علم میں نور سے بڑھ کر اور کوئی شئے زیادہ لطیف اور پاک نہیں اسی لئے خدا نور کہلاتاہے کیونکہ وہ قدوس ہے اوراسمیں تاریکی مطلق نہیں یعنی گناہ کا امکان تک بھی اس میں نہیں ہے۔اسلام سے ہماری شکایت یہی ہے کہ اس نے خدا کے قدس کا بیان اس طور سے نہیں کیا کہ اس کا خیال گنہگار کو دامنگیر ہوتا۔

دوم خدا کے ظہور کا بیان نور سے متصور ہے۔ نور کا خاصہ ہے کہ ظاہر ہووہ پوشیدہ نہیں رہ سکتا ۔ جہاں نور ہے وہاں اس کا ظہور ضرور ہوگا۔ ذات الہیٰ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس میں ظہور کا ملکہ ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے تیئں ظاہر فرماتاہے۔ اگروہ اپنے تئیں ظاہر نہ کرے تواس کی بابت ہم بالکل بے خبر اور بے علم ہوں۔ اس کی ذات کا علم اسی لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے تئیں ظاہر کرتاہے۔

خدا کا ظہور اول باطنی ہے۔جب عالم موجود نہیں تھا خدا کا نورموجود تھا۔ خدا ازل میں اپنے کوظاہر فرماتااور جس پر وہ ظاہر فرماتا تھا وہ اس کا مظہر تھا وہ مظہر خدا کی عین ذات ہی میں تھا اوراس لئے یہ ظہور باطن میں تھا اسی مظہر کےذریعہ سے خدا کا ظہور باطن سے خارج میں ہوا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خارجی چیزیں موجود ہیں یعنی خلقت عدم سے ہست ہوئی اسی مظہر نے خارجی موجودات کو خلق کیا" ساری

چیزیں اس کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں اورجو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہ ہوئی اس میں زندگی تھی اور وہ زندگی آدمیوں کا نور تھا"۔ جب خارج میں مخلوقات موجود ہوئی تو انسان اشرف المخلوقات بھی مخلوق ہوا اوراسی مظہر اللہ نے اشرف المخلوقات کی انسانیت کو قبول کیا اوراس کو مکمل بنایا۔وہ جو بغیر اس کے ادھوری تھی اب اس کے وصل سے پوری ہوئی ۔وہ جو گناہ کے باعث بگڑ گئی تھی اب اس کے ہمراہ ہونے اور اس کو مملو کرنے کے باعث پاکیزہ ہوئی " و ہ مظہر اللہ مجسم ہوا اور اس نے فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان خیمہ کیا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسے باپ کے اکلوتے کا جلال "۔

یہ مظہر اللہ ۔ یہ ذات الہیٰ میں ظہور کا ملکہ سیدنا مسیح ہے جو ازل سے ذات الہیٰ میں موجود تھا۔ جس کے ذریعہ عالم بنا اور بعد بننے کے جس نے انسانیت کو اختیار کیا اس کو اپنا مسکن بنایا یہ وہی ہے جس نے دعویٰ کیا کہ میں جہاں کا نور ہوں" اور جس کی شان میں یہ آیت آئی کہ " وہ اس کے جلال کی رونق اوراس کی ذات کا نقش ہو کر سب چیزوں کو اپنی قدرت کے کلام سے سنبھالتا ہے" نور سے نور حقیقی خدا سے حقیقی خدا ۔مصنوع نہیں بلکہ مولود۔اس کا اور باپ کا جوہر ایک ہی ہے۔

سورہ نور کے رکوع پانچ میں خدا کا بیان قرآن نے یوں کیا ہےاللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونِةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ الخ ترجمہ۔ اللہ آسمان اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے چراغدان جس میں چراغ ہو اور چراغ شیشہ میں ہو اور شیشہ چمکتے ستارہ کی مانند ہو وہ چراغ اس مبارک درخت زیتون سے جلایا جائے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی دے اگرچہ اسے آگ نے نہیں چھوا۔ روشنی پرروشنی ہے جسے چاہے اللہ اپنے نور کی راہ بتائے اور اللہ آدمیوں کے لئے مثالیں سناتا ہے اور اللہ ہر شئے کو جانتا ہے۔ اس آیت میں متعلق کئی امور غور طلب ہیں۔

۱ ۔خدا کا بیان بطور مثال جائز رکھا گیا ہے۔

۲ ۔ نور سے اس کی مثال دی گئی ہے اورمثال یہ ہے کہ کسی چراغداں پر ایک چمکتے ہوئے شیشہ میں چراغ ہے اور یہ چراغ مبارک زیتون کے درخت سے جلایا جاتا ہے۔

۳۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس چراغ کی روشنی زیتون کے درخت پر موقوف ہے۔ اگر اس آیت میں خدا تعالیٰ کا اعلیٰ تصور ازروئے قرآن بیان ہوا تو اس میں یہ بڑا نقص پیدا ہوا کہ اس نے خدا کو کسی دوسرے پر منحصر اور موقوف قرار دیا دریں خیال وہ قائم بالذات نہ رہا۔

۴۔ یہ قرآنی بیان اس شمعدان کا رنگ لئے ہوئے ہے جو یہودیوں کی عبادتخانوں میں تھا اور خیال گذتا ہے۔ کہ زیتون کے درخت کا ذکر بھی وہیں سے اخذ کیا گیا ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے نور کا قصہ۔ معارج النبوت میں ہے کہ جس وقت جبرئیل خلعت وجود سے سرفراز ہوئے باری تعالیٰ سے یوں سخن پرواز ہوئے کہ اے خدائے پاک مجھے پہلے کسی اور شئے کو تونے پیدا کیا یا نہیں حکم ہوا کہ اوپر دیکھ۔ اوپر سر اٹھایا تو ایک نور سرار سرور نظر آیا اورچار نور کو اس کے گرد پایا۔ عرض کیا خداوند یہ نور کس فیض کا معمور ہے جو مصداق نورعلیٰ نور کا ہے ارشاد ہوا کہ اے جبرئیل یہ ہمارے محبوب تمام جہان سے خوب محمد مصطفیٰ ﷺ کا نور ہے جس کو ہم نے جمیع مخلوقات سے پہلے پیدا کیا اور وہ ہمارا نہایت مقبول ومنظور ہے اور یہ چار نور گرد کے اس کے چار یارجان نثار ہیں سچے دیندار اور اسکے پکے غمگسار ہیں۔ یہی قول واتقان سیر ہے۔ ایسا ہی بیان عالمان خبر ہے اور سب سے معتبر ایک اور شاہد ہے یعنی حدیث صحیح میں وارد ہے اول ماخلق اللہ نوری یعنی مخلوقات ،خدا میں اول میرا نور ہے۔ اسی پر اتفاق جمہور ہے جب صانع باکمال اورخالق بیزوال کو اپنی ذات مستجمع کمالات کا ظہور منظور ہو تو اس کے نور میں سے جدا ایک پارہ نور ہوا اس سے فرمایا کن یا محمد یعنی پیدا ہوجاؤ اے محمد وہ نور مسمیٰ بمحمد ہو گیا پھر اس نور کے دس حصے کئے ایک حصے سے عرش دوسرے سے کرسی تیسرے سے لوح چوتھے سے قلم بنایا پھر نور کے پانچویں حصے سے چاند چھٹے سے سورج ساتویں سے بہشت آٹھویں سے دن نویں سے فرشتوں کو پیدا کیا۔ دسویں سے روح محمدی کو ہویدا کیا۔ قصہ کوتاہ وہ نور محمدی آدم سے باری باری اپنا قدم مقدم پشت بہ پشت دھرتا ہوا عبدالمطلب تک اوران سے عبداللہ حضرت پدر بزرگوار تک آیا۔

ہم نے اس قصہ کو مختصر کردیا ہے تاکہ ناظرین کا وقت ضائع نہ جائے اس کے تحریر کرتے وقت یہ خیالات حل طلب پیدا ہوئے۔ اول اس قصہ میں سے اواگون یا تناسخ کی بد بوآرہی ہے۔ نور محمدی کا آدم سے پشت بہ پشت عبداللہ تک آنا ایسا ہی ہے جیسا ہندوؤں کا مسئلہ جیوں روح ایک جونی سے دوسرے جونی ۔ ایک قالب سے دوسرے قالب کو نقل کرتی ہے۔ دوم۔ نور محمدی کی حدیث میں بھی اختلاف ہے کیونکہ مشکواۃ میں آیا ہے کہ خدا نے جس شئے کو اول خلق کیا وہ قلم تھا ۔ سوم اس نور محمدی کی فضیلت اس خیال سے بہت کم ہوجاتی ہے کہ اور چیزوں کو بھی خدا نے اسی نور سے پیدا کیا جس سے اس نے نور محمدی کو خلق کیا۔چہارم اگر نور محمدی کے قصہ سے ہمارے محمدی احباب آفتاب عالمتاب سیدنا مسیح جہان کے نور روشن دیجور مظہر اللہ کی حقیقت کو پہچانتے تو یہ قصہ ان کے مفید حال ہوتا اوران کے لئے اعلیٰ صداقت کا زینہ ٹھہرتا! پنجم۔ تعجب ہے کہ قرآن میں نور محمدی کا سوشہ تک بھی نہیں ملتا۔ کیا پیچھے کی افترا تو نہیں ہے؟

۳۔خدا محبت ہے۔ خدا کی ذات کا یہ بیان یوحنا رسول کے اول خط کے چوتھے باب کی آیت ۸ میں آیا ہے۔ سیدنا مسیح نے اس خیال کو ایک اور لفظ

سے ادا کیا ہے۔ وہ لفظ باپ ہے۔ خدا کی ابویت یعنی باپ ہونے کا مسئلہ مسیحی دین کی خاص تعلیم ہے اس کا اظہار بتکرار سیدنا مسیح ہی نے کیا ہے۔انبیاء سابقین نے خدا کو الوہیم اورایل شیدائی اوریہوواہ اوردیگر ناموں سے بیان کیا پر سیدنا مسیح نے اس کو باپ کے نام سے آشکارہ کیا اور ہمیں یہ سیکھایا کہ ہم اس کو " اے ہمارے باپ" کہکر خطاب کیا کریں۔

"اب اوررب" خدا کے تصوراسلامی اورعیسوی میں یہ ایک فرق عظیم ہے۔ نہ تو قرآن اور نہ کتب اسلام میں خدا " اب "کہلاتاہے ۔خدا کے ۹۹ ناموں ہیں جو اسلام میں رائج ہیں یہ طلائی نام پایا نہیں جاتا۔ اسلام اس سے بالکل بے خبر ہے۔ وہ خدا کو" رب " کہکر یاد کرتاہ اور عزیز جانتا ہے اور یہ بات بلکل اسلام کی طبیعت اور شیوہ کے موافق ہے۔ اسلام غلامی اوردہشت کی روح ڈالتا ہے اور جہنم کا خوف دلا کر لوگوں کو نیک بنانا چاہتا ہے۔ حاجرہ اور اسماعیل کا تخم اب تک ان میں موجودہے۔یہی سبب ہے کہ اسلام کی عبادت چند رسوم کی پابندی ہے اوریہی اس مذہب کی جان اورایمان ہے۔

برعکس اسکے مسیحی خدا کو باپ کہکر یاد کرتا اوراسی نام سے اس سے دعا کرتاہے وہ اپنے کو غلام نہیں گردانتا کیونکہ غلامی سے اس نے آزادی پائی ۔آگے کو وہ خدا کے فرزند ہونے کا حق رکھتاہے۔ وہ جہنم کی دہشت کے سبب نیک نہیں ہوا چاہتا بلکہ خدا کی محبت کی خاطر وہ گناہ کو ترک کرتاہے" اورچونکہ تم بیٹے ہو اس لئے خدا نے اپنے بیٹے کی روح ہمارے دلوں میں ڈالی جو ابا یعنی اے باپ کہکر پکارتی ہے۔ پس اب توغلام نہیں بلکہ بیٹا ہے اورجب بیٹا ہوا توخدا کے سبب وارث بھی ہوا"۔ افسوس اس برکت سے اسلام محروم ہے اورجب تک مسیح کو قبول نہ کریگا محروم رہیگا کیونکہ یحییٰ رسول کا قول ہے کہ جتنوں نے اسے قبول کیا اس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق دیا یعنی جو اس کے نام پر ایمان لاتے ہیں۔

خدا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب سیدنا مسیح نے جو کچھ دیا وہ اوپر ذکر ہوچکا اس کا لب لباب ہم پھر گوشگذار کرتے ہیں تاکہ ذہن نشین رہ جائے۔

۱ ۔ خدا روح ہے۔ وہ صاحب درت جو مادی اوراخلاقی اور روحی عالم میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔

۲ ۔"خدا نور ہے"۔ اس لئے وہ اپنے تئیں ظاہر فرماتا اوراس کا مظہر اس کا ابن مسیح خود ہے۔

۳۔" خدا محبت ہے"۔ اوراس لئے ہم اس سے محبت رکھ سکتے اس کی اس محبت کا اعلیٰ مکاشفہ سیدنا مسیح ہے۔

باب دوم
مسئلہ تثلیث کی تشریح

اس باب میں ہم تثلیث یا ثالوث اقدس کے اوق مضمون پر بحث کیا چاہتے ہیں اسلام اس مسئلہ سے بیزار ہے کیونکہ اس کے نزدیک یہ کفر اور شرک کا باعث ہے اس کے ذہن میں تثلیث توحید کی ضد ہے اور تثلیث کا قائل تین خدا کا پرستار ہے اور یہ صریح کفر ہے پھر اس کے گمان میں تثلیث کے ماننے والے خدا کی ذات میں مریم اور عیسیٰ ابن مریم کو شامل کرتے ہیں اور یہ صریح شرک ہے۔

قرآن نے بھی اس مسئلہ کو نہیں سمجھا اور س لئے یہ فرمایا کہ تقولو اثلثہ اس نے یہ خوش فہمی جمائی کہ تثلیث کے پرستار ایک بشر کو خدا بناتے یعنی عیسیٰ ابن مریم کو خدا قرار دیتے ۔علیٰ ہذا القیاس روح القدس جو قرآن کی اصطلاح میں جبرئیل فرشتہ ہے۔ عیسائیوں کی تثلیث کا ایک جز ہے اور یہ مخلوق ہے۔ اس کو تثلیث کے پیروذات الہیٰ میں شامل کرتے ہیں اور یوں مخلوق کو خالق قرادیتے ہیں۔ ان بے جا خیالات نے اسلام کو اس قدر گرفت کر رکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ اس کو خواہ مخواہ شرک اور کفر نظر آتا ہے۔

اس مسئلہ کا معقول ہونا ذیل کے نکات کے سمجھنے پر موقوف ہے۔

اول نکتہ - توحید- خدا کی وحدت کے قائل عیسائی - موسائی، محمدی تینوں ہیں۔اکثر یہ بہتان عیسائیوں پر لگایا جاتاہے کہ وہ خدا کوواحد نہیں مانتے پر یہ محض الزام ہے۔ انجیل اس بات کو صاف بتاتی ہے کہ خدا ایک ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ توحید کی تشریح کیا ہے؟ مسیحی دین میں توحید سے مراد ذات کی وحدت ہے۔ خدا واحد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات واحد ہے اور ذات کی وحدت سے ذات کا کمال مراد ہے۔ علم ہندسہ میں عدد ایک کمال کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ وہ اپنی قیمت اور وقعت کے لئے کسی اورعدد کا محتاج نہیں عدددو اور باقی سارے عدد ایک اور ایک کے میزان سے بنتے ہیں پر عدد ایک خود کسی عدد سے ترکیب نہیں پاتا اور اسلئے کسی عدد کا محتاج نہیں پس جب خدا کی ذات کی نسبت لفظ واحد استعمال ہوتاہے تو اس سے اس کی ذات کا کمال مراد ہے۔

دوم نکتہ - توحید اور تکثیر - خدا کی ذات واحد ہے پر اس کی وحدت میں کثرت موجود ہے۔ ذات الہیٰ جامع جمیع صفات ہے۔ یہ اوصاف اس کی ذات سے غیر نہیں لہذا صفات کی کثرت ذات کی وحدت میں ہے اس سے اسلام کا بھی اتفاق ہے۔ وہ اس کا ضرور قائل ہے کہ خدا کی ذات تو واحد پر اس کی صفات بسیار ہیں پس ذات الہیٰ کی وحدت میں صفات الہیٰ کی کثرت کا اسلام بھی قائل ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کی وحدت اعتباری ہے یعنی ایک اعتبار سے تو وہ واحد کہلاتاہے اور دوسرے اعتبار سے وہ واحد نہیں کہلاتا یا یوں کہیئے کہ ذات کے اعتبار سے وہ واحد اور صفات کے اعتبار سے وہ واحد نہیں ہے۔

سوم نکتہ۔ توحید اور تثلیث۔ ہم اول نکتہ میں یہ بیان کر آئے ہیں کہ توحید کا اطلاق ذات الہیٰ سے ہے اور نکتہ دوم میں یہ دکھاآئے ہیں کہ اس کی ذات میں بے شمار اوصاف ہیں یعنی اس کی وحدت میں کثرت موجود ہے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ خدا کی ذات واحد میں باطنی ذاتی تعلقات موجود ہیں۔ یہ تعلقات خارج سے اس کی ذات میں ملحق نہیں کردیئے گئے بس اس لئے شرک کا خیال ذات الہیٰ کی اس اندرونی کیفیت سے ہزارہا کوس دور ہے۔

یہ بھی غور طلب امر ہے کہ یہ تعلقات ذاتی ہیں اورچونکہ یہ ذاتی ہیں لہذا اس کی ذات واحد میں ہونے کی وجہ سے توحید کو مخل نہیں بلکہ سچ پوچھو تو یہ توحید ہی کی اندرونی کیفیت ہے۔ اسی کا نام تثلیث ہے کیونکہ یہ ذاتی تعلقات اور باطنی امتیاز تعلقات ثلثہ ہیں اور سند اس کی عقل اور نقل دونوں ہیں چنانچہ ہم آگے چل کر اس کا ذکر کرینگے۔

اس ساری تقریر سے یہ ظاہر ہے کہ جس طرح خدا ذات کے اعتبار سے واحد اور صفات کے اعتبار سے واحد نہیں بلکہ صفات کے اعتبار سے اس کی وحدت میں کثرت پائی جاتی ہے اسی طرح ذات کے اعتبار سے اس کی توحید کا خیال اور باطنی ذاتی تعلقات کے خیال سے اس توحید میں تثلیث کا خیال پیدا ہوتاہے۔ اور جس طرح سے اس کے صفات کی کثرت اس کی ذات کی وحدت کو مخل نہیں اسی طرح اس کی یہ باطنی امتیاز ثلثہ اس کی وحدت کو مخل نہیں ہے یعنی نہ توتکثیر اور نہ تو تثلیث توحید کی ضد ہے۔

خدا کی ذات میں باطنی امتیاز اور تعلقات ثلثہ کا ثبوت عقل اور نقل ہر دوسے دیا جاتاہے اوراس کا بیان یوں ہے۔

اول عقلی ثبوت۔ خدا کا ذاتی تصور ہمیں مجبور کرتاہے کہ ہم اس میں باطنی امتیاز کے قائل ہوں۔ ہم بیان کرآئے ہیں کہ خدا روح ہے۔ اس کا مطلب کم از کم یہ ہے کہ وہ صاحب علم ہے اور وہ جو صاحب علم ہے اپنے موجود ہونے کا علم ضروری رکھتا ہے اور وہ جو اپنے موجودہونے کا علم رکھتاہے یہ جانتا ہے کہ میں ہوں اور میں ہوں کا مطلب یہ ہے کہ میں تو نہیں اور تو نہیں یعنی اسی میں ذاتی امتیاز ہے اور یہ امر باطنی تعلقات پر دلالت کرتاہے۔ کیونکہ بلاتعلق اور نسبت کے میں اور تو کا خیال پیدا نہیں ہوسکتا۔

اس موقع پر ذاتی اور باطن کی قید قابل غور ہے ۔ خدا ازل سے ہے اور صرف وہی ازل سے ہے۔ مادہ حادث ہے نہ کہ قدیم اس لئے یہ امتیاز مادہ کے اعتبار سے نہیں پیدا ہوتاہے کیونکہ عدم سے تعلقات کا ہونا عقل کے خلاف ہے لہذا اس امتیاز کو عین خدا کی ذات ہی ماننا پڑیگا۔ جب نہ مادہ تھا اور نہ کائنات تھی تو یہ امتیاز کہاں سے خدامیں آیا۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ یہ امتیاز خارج سے اسی میں نہیں آیا بلکہ ازل سے اس کی ذات میں موجود تھا یعنی یہ امتیاز اور تعلقات ذاتی اور باطنی اور ازلی ہیں۔

ایک اورپہلو سے خیال کیجئے ۔ خدا نور ہے۔ ہم باب اول حصہ دوم میں بیان کرآئے ہیں کہ اس سے یہ مراد ہے کہ خدااپنے تیئں ظاہر کرنے کا ملکہ ہے ۔ یہ

ظہور اول ہی اول عین اس کی ذات میں ہوتاہے اور جس پر وہ ظاہر کرتا ہے وہ اس کا مظہر ہے ۔ اور چونکہ یہ ظہور باطن میں ہوتاہے لہذا اس کا مظہر عین اس کی ذات ہی میں ہے۔اس سے واضح ہے کہ اس کی ذات میں باطنی امتیاز ہے اور باطنی ہونے کی وجہ سے یہ ذاتی اورازلی ہے۔

خدا محبت ہے۔ اس سے بھی خدا کی ذات میں باطنی امتیاز اور ذاتی تعلقات کا خیال پیدا ہوتاہے ۔ کیونکہ محبت اپنے سے نہیں پر غیر سے ہوتی ہے اور چاہیے کہ وہ غیر ہم ذات بھی ہو کیونکہ کوئی شخص غیر جنس اور غیر ذات سے خاطر خواہ محبت نہیں رکھ سکتا اور نہ غیر ذات محبت کرنے والے کی محبت کو قبول کرسکتا اور نہ واجبی طور سے اس کو ادا کرسکتا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کا محبوب اصلی اور حقیقی وہی کرسکتاہے جو کہ اس کا ہم ذات ہے۔

خدا کی ذات ازلی ہے اس لئے یہ محبت بھی ازلی ہے اوراسی لئے اس کا محبوب بھی ازلی لہذا یہ نسبت بھی جومابین محب اور محبوب کے ہے ازلی ہونی چاہیے اورازلی ہونے کی وجہ سے ذاتی اور باطنی ہے۔

اب یہ بھی غور فرمائیے کہ نہ صرف خدا کی ذات میں باطنی تعلقات ہے اور یہ تعلقات اورامتیاز تعلقات ثلثہ ہے۔ اس کی تشریح بیان مذکورہ بالاسے بخوبی کی جاسکتی ہے۔ دیکھئیے جب خدا روح ہے تو روح متقضی علم اور عالم اور معلوم کی ہے اور یہ تعلقات ثلثہ ہیں۔ خدا نور ہے۔ اس سے بھی تعلقات ثلثہ کا خیال پیدا ہوتاہے کیونکہ نور مقتضی مظہر اور مظہر اورظہور کا ہے۔ علی ہذا القیاس یہ تعلقات ثلثہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ خدا محبت ہے ۔خدا کا یہ ذاتی تصور متقضی محب اور محبت اور محبوب کاہے۔ اسی تعلقات ثلثہ کا نام علم الہیٰ کی اصطلاح میں تثلیث ہے جس کو اب تک ہم نے ازروئے عقل دکھایا ہے اوراب اس کا ثبوت نقل سے بھی دیتے ہیں۔

دوم نقلی ثبوت۔ اس ثبوت کا دارومدار سیدنا مسیح کی تعلیم ہے جوآپ نے اپنی زبان فیض بیان سے دی ۔ آپ نے اس ذاتی باطنی تعلق کا بیان تین الفاظ سے کیا ہے اور وہ الفاظ باپ اور ابن اور روح القدس ہیں۔ جس وقت آپ نے اپنے شاگردوں کو روانہ کیا کہ جا کر تم لوگوں کو نجات کی بشارت دیں اس وقت آپ کا قول یہ تھا کہ آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اورانہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر بپتسمہ دو اورانہیں یہ تعلیم دو کہ ان سب باتوں کو مانیں جن کا میں نے تم کو حکم دیا اوردیکھو میں دنیا کے آخر تک ہر روز تمہارے ساتھ ہوں۔ اس آیت میں باپ اوربیٹے اورروح القدس کا ذکر ایک ہی ساتھ آیا ہے اوران کا درجہ مساوی قرار دیا گیا ہے۔ ہم اس بات کو بیان کرآئے ہیں کہ سیدنا مسیح خدا کو باپ لفظ سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اس کے ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں جس کا جی چاہے انجیل کھول کر دیکھ لے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ نے باپ یعنی خدا سے صادر ہونیکا دعویٰ کیا مثلاً مقدس یوحنا کی انجیل کے باب ۱۶ اورآیت ۲۷ ، ۲۸۔ میں مسیح کا قول مندرج ہے کہ میں باپ کی طرف سے نکلا۔ میں باپ سے نکل کر دنیا میں آیا پھر دنیا سے رخصت ہو کر باپ

کے پاس جاتا ہوں ۔ روح القدس کے حق میں بھی سیدنا مسیح نے یہ فرمایا کہ وہ باپ یعنی خدا سے نکلتا ہے چنانچہ اسی یوحنا کے ۱۵ باب کی ۲۶ویں آیت میں آیا ہے کہ جب وہ وکیل آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجونگا یعنی حق کی روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے۔

چہارم نکتہ۔ ابھی ہم نے یہ ذکر کیا ہے کہ سیدنا مسیح نے خدا کی ذات کے باطنی تعلق کا بیان تین ناموں سے کیا۔ باپ اور ابن اورروح القدس ہم ان کی مختصر تشریح یہاں پر کرتے ہیں۔

۱۔" باپ " لفظ " باپ" سے کسی طرح کی دنیاوی رشتہ داری مراد نہیں ہے۔ خدا کو باپ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ الوہیت کا منبع ہے۔ یونانی مسیحی علماء نے اس کو لفظ " آرخے" سے تعبیر کیا ہے۔ اوراس لفظ کے معنی اصل کے ہیں۔ وہ جو الوہیت کا سرچشمہ اوراس کی اصل ہے" باپ" کہلاتا ہے۔

۲۔" ابن" اس لفظ سے اکثر محمدی چونک اٹھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ اس کے مفہوم سے ناواقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذات الہیٰ کا خاصہ ہے کہ وہ ظاہر ہو۔ وہ جو اس ذات الہیٰ کو ظاہر کرتا ہے منبع الوہیت سے صادر ہوتا ہے۔ پس چونکہ منبع الوہیت کا نام باپ ہے وہ جو اس سے رواں ہوتا" ابن " یعنی بیٹا کہلاتا ہے۔ اس لفظ سے ذات کی وہ مناسبت مقصود ہے جو منبع الوہیت اوراس کے مظہر میں موجود ہے۔ وہ جو ذات کو اختیار کرتا بیٹا کہلاتا اور جس سے وہ اختیار کرتا باپ کہلاتا ہے۔

یہ ذات کا اختیار کرنا ازروئے تخلیق پر ازروئے تولید ہے۔ وہ ذات جو اختیار کی جاتی منبع الوہیت سے صادر ہوتی اوراس لئے یہ اسی کی ذات ہے اورظاہر ہے کہ اس کی ذات مخلوق نہیں ہے۔ اگر کوئی نئی ذات اختیار کی جاتی جو قبل از اختیار موجود نہ تھی تو یہ تخلیق ہوتی پر چونکہ باپ یعنی منبع الوہیت خوداپنی ذات کو ابن عطا کرتا ہے اس لئے یہ تولید ہے نہ کہ تخلیق۔

منبع الوہیت سے ذات کا یہ صدور اورظہور زمانہ ازل سے ہے اس لئے یہ تولید ازلی تولید کہلاتی ہے۔ جب سے خدا ہے تب سے اس کا صدور اورظہور ہوتا ہے یعنی خدا جس طرح سے ازلی ہے اسی طرح سے بیٹا جو باپ سے مولود ہوتا ازلی ہے۔

اس موقع پر یہ بھی قابل یاد ہے کہ تولید کا اصلی اور حقیقی تصور خود خدا میں پایا جاتا ہے۔ انسان میں تولید کا سلسلہ اس اصلی تولید کی گویا عکس ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسانی تولید بلاوساطت نہیں ہوتی اس کے لئے عورت کی ضرورت ہے پر الہیٰ صدور بلاوساطت ہوتا ہے۔ خدا بغیر کسی ذریعہ کے خود اپنی ذات کا مظہر پیدا کرتا ہے جو اس کا ابن کہلاتا ہے۔

مسیح کے ابن اللہ ہونے پر اکثر محمدی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بائبل میں آدم اور دیگر اشخاص بھی ابن اللہ کہلائے ہیں۔ پھر مسیح کی کیا خصوصیت رہی ؟

جواب یہ ہے کہ مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تخصیص ایک خاص لفظ سے کردی گئی ہے۔ وہ لفظ یونانی زبان میں " مونو گینس" ہے جس کے معنی ابن وحید

کے ہیں۔ابن اللہ کے ساتھ اس لفظ کا استعمال صرف سیدنا مسیح کی شان میں آیا ہے۔

ایک اورنام سے ابن اللہ مسیح کا بیان انجیل میں آیا ہے " یہ نام "لوگوس" ہے یہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی عقل اور کلام کے ہیں۔ مسیح ابن اللہ خدا کی ذات سے ایسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا کہ انسانی عقل انسان کی ذات سے تعلق رکھتی ہے اوراسی لئے وہ لوگوس یعنی الہیٰ عقل کہلاتاہے۔ پھر وہ لوگوس یعنی کلام اس لئے کہلاتاہے کہ الہیٰ عقل اور الہیٰ ذات اور الہیٰ صفات کا مظہر ہے اس نے اس بات کو صاف ان الفاظ سے ظاہر کیا" خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اسی نے بتادیا" انجیل یوحنا باب اول اورآیت ۱۸ پھر اس کا یہ قول بھی ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ یعنی خدا کو دیکھا "یوحنا باب ۱۴ اورآیت ۹۔

قرآن میں لفظ" کلمۃ اللہ " آیا ہے اور سیدنا مسیح کو یہ نام اس میں بھی دیا گیاہے پر افسوس کہ اس لفظ کی تفسیر میں اسلام کے علماء قاصر ہیں اور بھلا کیوں نہ رہیں یہ لفظ تو انجیل کی اصطلاح ہے اور بغیر اس کے اس لفظ کی شرح ہو نہیں سکتی اور یہ توظاہر ہے کہ فی زمانہ کے مولوی صاحبان انجیل سے بے خبر ہیں۔

۳۔ روح القدس ۔ یہ وہ حیات ہے جومنبع الوہیت او رمظہر الوہیت ہردو کو عام ہے اسی لئے اس کا صدور ان دونوں سے ہوتاہے۔ روح القدس باپ یعنی منبع الوہیت اوربیٹے یعنی مظہر الوہیت سے صادر ہوتاہے۔

اسلام نے روح القدس کی بھی حقیقت کو نہیں سمجھا۔سارے قرآن میں اس کا ذکر تین مرتبہ آیاہے۔ سورہ نحل رکوع ۱۴ میں یہ آیاہے کہ روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے براستی قرآن نازل کیا اور دومرتبہ اس کا ذکر عیسیٰ ابن مریم کے متعلق آیا کہ ہم نے اس کو روح القدس سے مدددی دیکھو سورہ بقرع ۱۱ اورع ۱۰۳۔

اسلام روح القدس سے جبرئیل فرشتہ مراد لیتا ہے اور قرآن بھی اس کی تائید کرتا کیونکہ جس طرح قرآن میں کہا ہے کہ روح القدس نے قرآن نازل کیا اسی طرح یہ بھی اس میں آیاہے کہ جبرئیل فرشتہ نے قرآن نازل کیا (دیکھو سورہ بقرع ۱۲)۔ پس قرآن کی اصطلاح میں جبرئیل اورروح القدس مترادف ہوئے اور یہ ازروئے دین مسیحی صریح کفر ہے کیونکہ دین عیسوی کے اصول کے موافق روح القدس کا تعلق عین ذات الہیٰ سے ہے پر جبرئیل فرشتہ محض مخلوق ہے۔

اس پر طرفہ تو یہ ہے کہ فی زمانہ کے مسلمان مولوی صاحبان نے روح القدس کی شان میں ایک نئی گڑھت نکالی اور نیارنگ چڑھایا ہے۔ وہ اب یہ شور مچارہے ہیں کہ روح القدس سے تو حضرت محمد صاحب مراد ہیں لیجئے صاحب ایک نہ شد دو شد۔ قرآن اس کو جبرئیل بتاتا اورمولوی صاحبان اس کو حضرت محمد صاحب بتاتے۔ یہ عجب رنگ ہے۔!!

اس ساری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ تثلیث کا تعلق خدا کی ذات سے ہے وہ ذات واحد ہے اس ذات واحد کا انکشاف ہوتا۔ یہ انکشاف پہلے باطن میں ہوتا۔ جس

کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ذات الہیٰ میں باطنی تعلقات اور نسبت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نسبت تعلقات ثلثہ ہے جس کو انجیل کی اصطلاح میں باپ اور ابن اور روح القدس کہا ہے۔ اس عظیم صداقت کو دین عیسوی کے علم الہیٰ کی اصطلاح میں تثلیث یا ثالوث اقدس کہتے ہیں۔

اس ادق مضمون کا کاشف سیدنا مسیح خود ہیں۔ اس نے ذات الہیٰ کی جو واحد ہے یوں ہی تشریح کی ہے۔ اسلام توحید کا یعنی ذات الہیٰ کی وحدت کا قائل ہے پر اس ذات کی اندرونی کیفیت سے ناواقف ہے اور اسی لئے تثلیث سے غافل ہے۔ سچ یہ ہے کہ مسئلہ تثلیث مسئلہ توحید کی تشریح اور تفسیر ہے اور اس کا مفسر سیدنا مسیح ہے جس نے اس راز کو دنیا پر کھول دیا اور خدا کو سب پر ظاہر کیا۔

دین عیسوی توحید اور تثلیث دونوں کا قائل ہے یعنی وہ خدا کی ذات واحد کی بیرونی اور اندرونی ہر دو کیفیت کا علم رکھتا ہے۔ اسلام میں ادھوری پر دین عیسوی میں خدا کے ذات کی پوری صداقت موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دین مسیحی جامع جمیع صداقت ہے۔

باب سوم

مظہر ذات خدا

خدا تعالیٰ کے باطنی ظہور کا بیان ماسبق میں ہوچکا ہے۔ اس باب میں ہم ذات الہیٰ کے خارجی ظہور کا ذکر کیا چاہتے ہیں۔ خدا نہ صرف اپنے باطن میں اپنے تئیں ظاہر فرماتا ہے بلکہ خارج میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کے باطنی ظہور کا نام مسیحی علم الہیٰ کی اصطلاح میں تثلیث ہے اور اس کے خارجی ظہور کا نام تجسم ہے۔

موجودات کی تفصیل دونوں پر کی گئی ہے یعنی مادہ اور روح۔ جتنی چیزیں دنیا میں موجود ہیں یا تو روح یا تو مادہ کی قسم سے ہیں۔ مادہ غیر متحرک اور مکان کا محتاج رہتا ہے۔ جس وقت خارج سے اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اس وقت بھی اس کی یہ احتیاج بنی رہتی ہے۔ مادہ کی اس حرکت دینے والی شئے کا نام روح ہے۔ ان دو یعنی مادہ اور روح کا وجود میں آنا عین خدا کی قدرت اور محبت کا ظہور ہے خدا ان کا خالق اور وہ مخلوق ہیں۔

مادہ کا مذہبی نظارہ! دنیا کی مذہبی تاریخ اس امر کو بڑی صفائی سے بتارہی ہے کہ مذہبی اشخاص کے دل اور دماغ پر مادہ نے دین کا بڑا اثر ڈالا ہے مادہ سے دین کو ایک قسم کا بڑا بھاری نفع حاصل ہوا ہے۔ اس کی تشریح اور تصدیق کے لئے ذرا ویدوں کے منتروں کو کھول کر دیکھئے۔ اس کے لکھنے والے مادی اشیاء کی طرف

مخاطب ہو کر اپنی دلی آرزو کو پیش کرتے تھے" اے کاشکہ ارض وسماہماری سماعت کرے۔ آب اور آفتاب کو اور کواکب مع وسیع خلا کے۔ کاش کہ مترا اور وردن اور ادیتنی اور بحر اور ارض اور سما ہمیں دلشاد کرے" ہند سے فارس کی طرف رجوع کیجئے اور خیالات کے یہی لہر لہرارہے ہیں"۔ ہم اہور مزدہ کی پرستش کرتے۔ ہم اس کی قدرت اور عظمت او ررحمت کی خاطر اس کی عبادت کرتے اور ہم اس ارض کی پوجا کرتے۔ اے پانیو اب ہم تیری پرستش کرتے۔ اس بارش کی جو ہم پر پڑتی اور اس پانی کی بھی جو کنڈوں میں جمع ہے"۔ فارس سے کنعانی سرزمین کی سیر کیجئے اور موحد کے پاکیزہ خیالات کے جھونکے ماددی عالم کے بے نظیر نظارہ کو کیا ہی سرسبز کررہے ہیں" آسمان خدا کا جلال بیان کرتے اور فضا اس کی دستکاری دکھلاتی"۔ وہ ستاروں کو شمار کرتا اور ان کو نام لے کر بلاتا"۔ سمندر اس کا ہے اور اس نے اسے بنایا اور اس کے ہاتھوں نے خشکی کو تیار کیا"۔ خداوند کی آواز دیواروں کو چیرتی ہے خداوند کی آواز جلال والی آواز ہے"۔

شعرا کے کلام کو نظر انداز کرکے اگر ہم فلسفہ کے اقوال کو سنیں تو دلچسپی ویسے ہی بنی رہتی ہے جیسے پہلے تھی۔ ماددی عالم اور اسکی خوبصورتی اور تطبیق اور تحویل کا نقشہ سقراط اور افلاطون اور ارسطاطالیس جیسے حکماء پر پڑا اس سے فلسفہ کے طلبا واقف ہیں۔ افلاطون نے اس مادّی عالم کو بالخصوص اس کی خوبصورتی کو الہیٰ تصورات کا مظہر قرار دیا ہے اور ارسطاطالیس نے ان الہیٰ تصورات کو مادّی قالب سے علیحدہ ناقص اور غیر مکمل بتایا ہے ان خیالات کے اثر سے جدید افلاطونی اور ستوئیقی مذہب جاری ہوا جن میں سے اول الذکر نے خدا کو خلقت سے لطیف اور آخرالذ کرنے مادہ سے محیط بیان کیا۔ عالم سنیکا کا قول کس قدر پرُمعنی ہے۔ خلقت کیا ہے ؟ خدا اور الہیٰ عقل جو دنیا اور اس کے حصوں میں سرایت کئے ہوئے ہے اور اخذ کیا ہے؟ جو کچھ تو دیکھتا اور جو کچھ تو نہیں دیکھ سکتا وہ اسی کا مجموعہ ہے۔ فی زمانہ کی تصانیف میں بھی اس کا رنگ نمایاں ہے۔ خلقت کے ہر پتے سے خدا کا پتہ لگایا جارہاہے۔ ذرا سنئیے۔

یہ آفتاب ہے گرم اس کی کبریائی کا
کہ ذرہ ذرہ ہے آئینہ خود نمائی کا
دوسرا کون ہے جہاں توہے
کون جانے تجھے کہاں توہے
لاکھ پردوں میں توہے بے پردہ
سو نشانوں پہ بے نشان توہے
توہی خلوت میں توہی جلوت میں
کہیں پنہاں کہیں عیاں توہے
نہیں تیرے سوا یہاں کوئی
میزبان توہے مہمان توہے
نہ مکان میں نہ لامکان میں کچھ
جلوہ فرمایہاں وہاں توہے

رنگ تیرا چمن میں بو تیری

خوب دیکھا تو باغبان تو ہے

مولانا جلال الدین کی مثنوی میں سے یہ کیسی گمک آرہی ہے۔

از جمادی مردم و نامی شدم

وز نما مردم بحیوان سرزدم

مردم از حیوانی وآدم شد

پس چہ ترسم کے زمردن کم شدم

حملہ دیگر جمیرام از بشر

تا برآرم از ملائک بال و پر

بار دیگر از ملک پران شوم

انچہ اندروہم نادید آن شوم

پس عدم گردم عدم چون ارغنون

گویدم کا ناالیہ راجعون

مادی عالم کا یہ نظارہ خاموش پر عمیق گویائی سے یہ کہہ رہاہے کہ مادہ اہل فہم کی نگاہ میں کوئی نکاری شئے نہیں ہے۔ مادہ کے پردہ میں خدا موجود ہے۔ یہ مادہ اس کی قربت کا خیال پیدا کررہا ہے۔ وہ اس کی پہچان کا گوادنی ہی کیوں نہ ہو پر ایک زینہ ہوسکتا ہے۔

روح اور مادہ کا تعلق۔ ہم بیان کرآئے ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں سب یا تو روح یا تومادہ کی قسم میں سے ہیں۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح اور مادہ کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس کا زندہ جواب انسان خودہی ہے وہ ایسا مخلوق ہے جس میں روح اور مادہ دونوں کا اجتماع ہوا ہے اور اس لئے اس کی کیفیت اور حالت پر نگاہ کرنے سے اس سوال کا جواب جلد مل سکتا ہے۔ اب اگر ہم دوچار الفاظ میں اس کا جواب دیں تو وہ جواب یہ ہے کہ مادہ کے ذریعہ سے روح کا ظہور ہوتا ہے مثلاً دیکھئے دماغ اور اعصاب کے ذریعہ سے ذہن اپنا کام کرتاہے اور عضلات کے ذریعہ سے روح اپنا جلوہ دکھاتی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ہم انسان کی طبیعت اور سیرت کو اس کے ہاتھ کے مس سے اور اس کی آواز کے لہجہ سے اور اسکی آنکھ کی چمک سے پہچان لیتے ہیں۔ اب ایک اور بات پر غور کیجئے ۔ گو روح کا ظہور مادہ سے ہوتاہے پر پھر بھی روح مادہ پر موقوف نہیں۔ وہ اس سے آزاد ہو کر بھی کام کرتی ہے مثلاً انسان میں قوت متخیلہ ہے جس سے وہ ذکر کرسکتا ہے ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انسان اس معاملہ میں اپنے مادی جسم کا غلام نہیں ہے۔ گو انسانی روح فکر کرتے وقت انسانی جسم میں موجود رہتی ہے پر پھر بھی اس سے محدود نہیں ہوجاتی بلکہ وہ ان چیزوں کا بھی خیال پیدا کرسکتی ہے جواس سے ہزاروں کوس دور اور برسوں سے علیحدہ ہیں۔ اخلاق کے عالم میں تو یہ بات اور بھی واضح ہے۔ انسان کا مادی جسم بدل جاتاہے۔ اور بقول علماء سات برس میں نیا بن جاتاہے پر انسان بوجود اس مادی تبدیلی کے اپنے اعمال اور افعال اور اقوال کا ہمیشہ جوابدہ رہتاہے ۔ وہ یہ

نہیں کہہ سکتا ہے کہ چونکہ سات برس گذر گئے اور میرے جسم کے مادّی ذریعہ نئے ہوگئے اس لئے میں اپنے ان کاموں کا جو پُرانے ذروں سے ہوئے اب ذمہ دار نہیں ہوں۔

روح اورمادہ کا یہی تعلق ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ روح مادہ کو اپنے ظہور کا آلہ بناتی ہے اور پھر بھی اس کی محکوم نہیں ہوجاتی بلکہ وہ عامل رہتی اورمادہ اس کا معمول رہتاہے۔

کیا تجسم ممکن ہے ؟ کیاخدا کاظہور طبقہ انسانیت میں ممکن ہے ؟

بیان مذکورہ بالا کو زیر نظر رکھنے سے اس سوال کا جواب دینا نہایت ہی آسان ہوجاتاہے ۔ ہم بلاخوف یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا ظہور طبقہ انسانیت میں نہ صرف ممکن بلکہ نہایت ہی معقول اور انسب معلوم پڑتاہے ۔ ہم اس امر کو دکھاآئے ہیں کہ مادہ سے خدا کی خوبی اوراس کی قدرت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے اور نیز یہ بھی کہ مادہ روح کےظہور کا ذریہ اور آلہ ہے۔ پس جب مادہ اور روح کی یہ صورت ہے تو یہ نہایت ہی معقول معلوم ہوتاہے کہ خدا کا ظہور ایسے وجود سے ہو جس میں مادہ اورروح دونوں ایک جاجمع ہیں۔ ایسا مخلوق انسان ہے جو افضل المخلوقات اور اشرف الموجودات ہے۔ اس میں روح اور مادہ دونوں کا اجتماع ہوا ہے اور انسانیت کی یہ فضیلت اس کو مظہر اللہ ہونے کے رتبہ تک پہنچاتی ہے اور ہمارا تو یہ خیال ہے کہ خدا نے اس کو یہ فضیلت اسی لئے دی ہے کہ اس کو اپنی ذات اور صفات کے ظہور کا علیٰ ذریعہ بنائے۔

انسان کی فضیلت کا ایک اورسبب ہے ۔وہ یہ ہے کہ خدا نے اول انسان ابوالبشرآدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا تھا۔ اس صورت سے خدا کے اخلاقی صفات مراد ہیں مثلاً اس کا قدس اس کی محبت اس کی نیکی۔ یہ صفتیں خدا نے انسان کو بھی عطا کی ہیں۔اس کے باعث وہ تفریق المخلوق یعنی اور مخلوقات سے علیحدہ ہے۔ دنیا میں مخلوقات کے مختلف طبقے ہیں۔ جمادات اور نباتات اور حیوانات کے طبقے۔ نباتات کا طبقہ جمادات سے اعلیٰ ہے اوراسی طرح حیوانات کا طبقہ جمادات اور نباتات کے طبقے سے اعلیٰ ہے اور انسان ان سب سے اعلیٰ ہے اوراسکی وجہ یہ ہے کہ اس میں اخلاقی صفات ہیں۔ یہ صفات نہ صرف تفریق الخالق بھی ہیں۔ اس کے ذریعہ سے انسان خدا سے قربت پیدا کرسکتا ہے۔ اس تعمیم کی بنا پر خدا کی ذات اور صفات کاظہور طبقہ انسانیت میں ہوسکتاہے۔

خدا کے اخلاقی اوصاف متقضی مظہر ہیں۔ یہ تقاضا خلقت کے ادنیٰ طبقے سے پورا نہیں ہوسکتا۔ جمادات اور نباتات اورحیوانات سے خدا کی قدرت اور عظمت اور بزرگی توظاہر ہوتی پر ان سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ خداقدوس اوررحیم اور عادل ہے الہیٰ اخلاقی اوصاف کا اعلیٰ ظہور صرف خلقت کے اعلیٰ طبقہ میں ہونا انسب معلوم ہوتاہے ۔ عقل اس کوبخوبی قبول کرتی ہے اور اس لئے وہ اس کی قائل ہوتی ہے کہ خداانسانیت کو اختیار کرسکتا اوراس کو اپنا مظہر بناسکتاہے یعنی دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تجسم ممکن ہے۔

اسلام میں مظہریت کا مسئلہ ۔ عموماً یہ کہنا صحیح ہے۔ کہ اسلام اس مسئلہ سے ناواقف ہے پھر بھی ہم اس کا سراغ اس کی کتابوں اوراسکے معلموں کے خیالات میں پاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں یہ مسئلہ پھیلا ہوا تھا ۔ پیغمبر عرب کے زمانہ سے پہلے اوران کے زمانہ میں مدینہ کا نخلستان چند صوفیوں کا زاویہ عزلت تھا۔ ملک شام میں بھی اسلام سے پہلے صوفیوں کے ذکر وفکر کی آواز گونجتی تھی۔ ہندوستان میں ویدانتیوں کا اکھاڑا تھا۔

اسلام میں اس مسئلہ کا تخم موجود ہے۔ ہم فرقہ اسمعیلیہ کے مرغوب عقیدہ میں جوشیعوں کی ایک شاخ ہے یہ حسن عقیدت پاتے ہیں کہ حضرت علی مظہر خدا ہیں حضرت علی کے خیالات جوخدا کی ذات اور صفات کی نسبت میں اگر بغور دیکھے جائیں تو ایسا معلوم ہوتاہے کہ ان سے مظہریت ٹپک رہی ہے۔ نہج البلاغت میں حضرت علی کا قول یوں نقل ہوا ہے ۔ کمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ۔ یعنی خلوص کا کمال ذات باری سے صفات کی نفی کرتی ہے مگر جب یہ اخلاص درجہ کمال کو پہنچتا ہے تو وہ سمجھتاہے کہ یہ صفات ممکنات سے ماخوذ ہوتے ہیں اس لئے وہ اس واجب الوجود ذات باری میں نہیں ہوسکتیں۔ پس وہ ان سب کو ذات باری سے نفی کرتا اورکہتاہے لیس ہوعالم وہ عالم نہیں ۔ لیس ہوحی وہ زندہ نہیں لیس ہوقا دروہ قادر نہیں انا لعلم حقیقتھا۔ ہم ان کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ اس موقع پر کسی نے خوب کہا ہے گو حضرت علی خلیفہ تھے مگر ان کی یہ تعلیم پیغمبر عرب سے قطعی جداگانہ تھی اور کبرائے صوفیہ کے مذاق کے موافق ہے۔ جب اس کی ذات میں صفات کو تسلیم نہ کئے جائیں تو معبوداورعابد کا تعلق کچھ نہیں رہتا۔ خدا کسوت انسانی میں جلوہ گرہوکر مجمع انسانی کو ہدایت کرتا ان کو اپنی تقدس ذاتی کا نمونہ بناتاہے۔اس باب میں کسی محقق نےلکھاہے کہ مظہریت کے مسئلہ کا تخم حضرت علی نے بویا تھا امام حسین نے سینچا اور حضرت اسماعیل نے اس کے ثمرات کو بازاروں میں نیلام کیا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے امام حسین کا نام اس لئے لیاتا کہ ان کی کتاب مراۃ العارفین جس کو انہوں نے اپنے بیٹے زین العابدین کے لئے تصنیف کیا جس میں وہی رکن اعظم رہیں جو کبرائے تصوف کے ہیں۔

اب ایک اور قابل غور امر پیش کیا جاتاہے۔ مسئلہ مظہریت کا تخم نہ صرف اسلام کے کئی ایک فرقوں میں منتشر ہے بلکہ خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ دیکھئے سورہ نمل کے پہلے رکوع اورایات ۷، ۸، ۹ میں مرقوم ہے۔

إِذْ قَالَ مُوسَى لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ فَلَمَّا جَاءهَا نُودِيَ أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ يَا مُوسَى إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

ترجمہ: جب موسیٰ نے اپنے اہل سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے ۔ میں وہاں سے تم پاس کوئی خبر یا جلتی ٹیہی لاؤنگا کہ تم سب سینکو۔ جب وہاں آیا توآواز دی گئی کہ جو شخص آگ میں ہے اور جوآگ کے گردا گرد ہے مبارک ہے اور اللہ جہان کا رب پاک ذات ہے اے موسیٰ بے شک میں غالب حکیم اللہ ہوں۔

اے ناظرین۔ غور کیجئے کہ ازروئے قرآن خدا کی ذات پاک کاظہور آگ میں، فی النار ،اور آگ کے گرداگرد۔ ومن حولہا۔ ہوتاہے۔ پس اگر خدا آگ میں اور آگ کے گرد ظاہر ہوسکتا۔ تو کیوں وہ انسانیت میں ظاہر نہیں ہوسکتاہے۔ اگر آگ اس کے ظہور کا ذریعہ ہے تو کتنا زیادہ انسانیت مظہر اللہ ہوسکتی ہے۔

انا اللہ العزیزالحکیم!

باب چہارم

مسیح مظہر اللہ

باب ماسبق میں ہم نے مسئلہ مظہریت پر بحث کی اور یہ ثابت کیا کہ خدا کا انسانیت کو قبول کرنا ممکن اور عقل کے خلاف نہیں ہے۔ اس موقعہ پر ہم نے اس امر کا بھی اظہار کیا کہ قرآن اوراسلام میں سے بھی اس کی خوشبو آرہی ہے۔ اب اس باب میں ہم اس کے امکان سے قطع نظر کرکے اس کے وقوع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ مژدہ دیتے ہیں کہ وہ بات جو عقلاً ممکن تھی فی الحقیقت واقع بھی ہوئی۔

کسی امر کا وقوع میں آنا تاریخ سے تعلق رکھتا ہے لہذا اس عظیم الشان صداقت کا بھی ثبوت تاریخ پر موقوف ہے۔ دنیا میں وہ تاریخ جس میں اس واقعہ کا ذکر آیا ہے انجیل کے نام سے مشہور ہے۔ غور کی جاء ہے کہ ہم اس بحث میں انجیل کو کلام اللہ کے اعتبار سے نہیں پیش کرتے ہیں۔ پر صرف اس کو تاریخ کی حیثیت سے گوشگذار کرتے ہیں۔ انجیل کا مطالعہ کرنے والا اس کی تاریخ خاصیت سے بخوبی واقف ہے۔ اس میں ایک شخص کی زندگی کا احوال اس کے کام اس کی تعلیم اوراس کے دعوے سب مندرج ہیں۔ وہ شخص عیسیٰ المسیح ہے۔ اس کی زندگی وہ مژدہ اور بشارت ہے جو انجیل کہلاتی ہے۔

انجیل کی یہ خاصیت اسلام کے ایک بہتان کی تردید لاعلاج طور پر کررہی ہے۔ وہ اسلامی بہتان تنسیخ ہے۔ اس کا یہ قول کہ قرآن شریف کے آنے سے انجیل منسوخ ہوگئی انجیل کی تاریخ خاصیت کی روشنی میں محض مہمل سا معلوم پڑتا ہے۔ کیا کوئی کتاب تاریخی واقعات کو منسوخ کرسکتی ہے؟ ہر گز نہیں! یہ عقلاً محال ہے:

انجیل اناجیل اربعہ کے نام سے موسوم ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ سیدنا مسیح کی زندگی کے تحریر کرنے والے چار اشخاص تھے جن کے نام متی اور مرقس اور لوقا اور یوحنا ہیں۔ ان میں سے دومعنی متی اور یوحنا سیدنا مسیح کے خاص مصاحبوں میں سے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسکے ہمراہ رہتے تھے اوراس کے کام اور کلام کے دیکھنے اور سننے والے تھے۔ وہ سیدنا مسیح کی زندگی کے چشم دید گواہ ہیں اوراپنے بیان کے خاتمہ پر اپنی شہادت کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ " یہ وہی شاگرد ہے جو ان باتوں کا گواہ اورلکھنے والا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی گواہی سچی ہے"۔ باقی دویعنی لوقا اور مرقس سیدنا مسیح کے رسولوں یعنی پولوس اورپطرس کے ہم سفر اور ہم خدمت تھے۔ انہوں نے بعد تحقیق اور تفتیش اپنی انجیل تحریر کی اوران میں سے لوقا نے اپنی تحقیق کا مرتبہ یوں بیان کی ہے کہ " چونکہ بہتوں نے اس پر کمر باندھی ہے کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں جیسا کہ انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے انہیں ہم کو سونپا۔ اس لئے اے معزز تھیفلس میں نے مناسب جانا کہ سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کرکے انہیں تیرے لئے ترتیب سے لکھوں تاکہ جن باتوں کی تونے تعلیم پائی ہے ان کی پختگی جان لے۔

غور کا مقام ہے کہ انجیل کے تحریر کرنے والے چار معتبر شخص ہیں۔ محقق کے لئے چار شخص کی گواہی یقین دلانے کےلئے کافی اور وافی ہوا کرتی ہے۔ اگر کوئی سچ مچ راستی کا خواہاں اورحق کا جویاں ہے تو وہ اس شہادت اربعہ پر اپنے ایمان کا فیصلہ کرسکتاہے۔ ہاں وہ راستی اور صداقت کی تحقیق مختلف پہلو سے کرسکتا اوریوں سیری پاسکتا ہے۔ انجیل کا چار اشخاص سے لکھا جانا مصلحت ایزدی سے خالی نہیں۔ ایک ہی زندگی کا بیان چار مختلف صورتوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً مقدس متی سیدنا مسیح کو المسیح ثابت کرنے کی غرض سے اپنی انجیل تحریر کرتاہے۔ وہ بار بار اس بات کا اعلان کرتاہے کہ سیدنا مسیح وہی شخص ہے جس کا ذکر انبیاء سابقین نے پیشتر کیا ہے۔ ان کی نبوت کا مصداق وہی ہے۔ قوم کا مخلص وہی ہے۔ جہان کا شاہنشاہ وہی ہے۔

مقدس مرقس ایک اور ہی پیرائے میں اسی زندگی کو قلمبند کرتاہے وہ مسیح کو عبداللہ کی صورت میں تاریخ کے سٹیج پر لے آتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ وہ جو خدا کی صورت تھا انسان کی شکل اختیار کرتا اور خادم بن کر موت تک ہاں صلیبی موت تک فرمانبردار رہتاہے۔

مقدس لوقا سیدنا مسیح کی زندگی کے اس پہلو پر تاکید کرتاہے جس سے یہ ظاہر ہوتاہے کہ وہ نہ صرف یہودیوں کا بلکہ غیریہودیوں کا بھی نجات دینے والا ہے۔

سارے جہان کا معلم ہے۔ ساری قوم کا مغز ہے۔ وہ الانسان ہے۔ وہ انسان کا کاہن ہے جو اپنی زندگی بنی آدم کے لئے قربان کردیتا ہے۔

مقدس یوحنا اور مسیح کو مظہر اللہ کرکے بیان کرتا ہے۔ وہ اس کی حقیق ذات اور صفات اور اصلی صورت اور سیرت کا نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ اس کی ماہیت پر بحث کرتا اور یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وہ لوگوس یعنی کلمۃ اللہ ہے جو جسم میں ظاہر ہوا۔ وہ حیات ہے۔ وہ حق ہے۔ وہ نور ہے۔ وہ محبت ہے۔

اس انجیل کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خدا کا ظہور انسانیت میں نہ صرف ہوسکتا ہے بلکہ ہوچکا ہے۔ سیدنا عیسیٰ وہی شخص ہے جو مظہر اللہ ہے اس کے متعلق ذیل کے نکات غور طلب ہیں۔

اول۔ طریق ظہور۔ عقل اس مسئلہ میں یہ کہتی ہے کہ اگر خدا انسانیت کو اختیار کرے تو معمولی طریق سے نہ کریگا اس کام کے انجام دینے میں غیر معمولی وسیلہ کو اپنا آلہ بنائیگا۔ اور وجہ اس کی صاف ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر وہ معمولی طریق سے انسانیت کو اختیار کرتا ہے تو وہ انسانیت جو اختیار کی جاتی محض معمولی ہوگی یعنی دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ جہان ہزارہا انسان تھے وہاں اسی زمرہ میں ایک اور کی ترقی ہوئی جس سے کچھ نفع ہاتھ نہ آیا اور ظہور کی غایت بالکل پوری نہ ہوئی۔ اس طریق سے انسانیت کا اختیار کرنا کارفضول ہوتا اور خدا تعالیٰ کی شان کے لائق بھی نہیں ٹھہرتا۔ پس خدا قادر مطلق جس وقت انسانیت میں ظاہر ہوتا ہے اس وقت وہ ایک نئے طریقہ سے نئی انسانیت کو جواس کے لائق ہو ظہور میں لاتا اور اس کو اپنے ظہور کا معقول ظرف بناتا ہے۔

معمولی طریقہ انسانیت کے اختیار کرنیکا وہی ہے جو اسوقت دنیا میں رائج ہورہاہے یعنی مرد اور عورت کے اجتماع سے ایک تازہ انسان جہان میں آجاتا ہے۔ تولید تناسل کا معمولی قاعدہ خدا تعالی نے یہی ٹھہرایا ہےاور فطرت کی یہی عادت ہے۔ اس قانون فطرت میں یہ بات غور طلب ہے کہ ایک ہی قسم کی جنس کے دو نوع جب ایک ساتھ اتفاق کرتے ہیں تو ایک نیا فرد جو ان کا ہم جنس ہے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جس وقت مرد اور عورت جو ایک ہی جنس کے دو نوع ہیں آپس میں تعلق پیدا کرتے تو ایک نیا فرد جو ان کا ہم جنس ہے یعنی جو خود ہی ان کا سا انسان ہے دنیا میں صورت پکڑتا ہے۔ ایک اور امر اس قانون قدرت کے متعلق غور کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت ہی وہ ظرف ہے جہان اس نئی حیات کی تولید اوراسکے نشوونما کا سامان خدا تعالیٰ نے مہیا کیا ہے۔ توریت کے مصنف نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ حوا زندوں کی ماں ہے۔

خدا جب انسانیت کو اختیار کرتا تو ایک نئی انسانیت کو صورت دینا اور اس لئے ایک نئے طریقے سے اپنا کامل ظہور دنیامیں دکھاتا ہے اس نئے طریقہ میں ایک ہی جنس کے دو نوع کے اجتماع کی قید جاتی رہتی ہے۔ مرد کی جو گویا معمولی طریقہ سے منبع سیات ہے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کے عوض حیات کے حقیقی اور اصل منبع اور چشمہ سے کام لیا جاتا ہے اور وہ جو خدا کی روح پاک ہے جس

نے اس ساری خلقت میں حیات ڈالا اور جو مادہ اور ارواح کا زندہ رکھنے والا اور قائم کرنے والا ہے۔ وہی حیات کا آغاز اور ابتدا اور علت ہے۔ اسی روح القدس کے ذریعہ سے سیدنا عیسیٰ المسیح بطن مریم میں آیا۔

حیات کے اس نئے سلسلہ میں عورت کی گنجائش تو رہی پھر اس میں بھی ایک انقلاب ڈال دیا گیا۔ عورت کے زمرہ میں دو قسم کی عورتیں ہوتی ہیں۔ایک تو شادی والی دوسری کنواری ۔ نئی انسانیت کے اختیار کرنے میں شادی والی کے مقابلہ میں کنواری کو ترجیح دی گئی کیونکہ ان دو میں سے صرف باکرہ ہی اعلیٰ اور معقول ظرف نئی انسانیت کی ہوسکتی ہے ۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ اگر باکرہ اس شرف کے قابل ہے تو مرد کی ضرورت مفقود ہوجاتی کیونکہ اس کی ضرورت عورت کے باکرہ ہونے کو مانع اوراس کی مزاحم ہے۔ پس سیدنا عیسیٰ المسیح کی پیدائش کسی شادی والی عورت سے نہیں پر کنواری مریم سے ہوئی۔

اس طریق ظہور میں انسان کی خواہش اور مرضی سے کچھ بھی نہیں ہوتا ہے خود مریم بھی اس بات کی خواہاں نہیں ہے کہ میں ماں کا منصب حاصل کروں وہ کنواری ہوکر بچہ کی مطلق آرزو نہیں رکھ سکتی ہے اورچونکہ اس معاملہ میں اس کی مرضی معدوم ہے لہذا یہ اس کا فعل نہیں قرار دیا جاسکتا ہے اوراگر یہ اس کا فعل نہیں ہے اور نہ کسی اورانسان کا تو ضرور یہ خدا تعالیٰ کا فعل ہوگا۔ یہ سب کچھ اس کی شان کے لائق ہے۔ اس قسم کے طریق ظہور کو عقل خواہ نخواہ خدا ہی سے منسوب کرتی ہے اور کسی دوسرے سے ہرگز ہرگز منسوب کر نہیں سکتی اوراس لئے عاجزآآکر اسکو قرار کرنا پڑتا ہے کہ اگر خدا انسانیت کو اختیار کریگا تو اسی طور سے کرسکتا ہے اوراگر ایسا واقعہ فی الواقع دنیا میں وقوع میں آیا تو فی الحقیقت خدا نے انسانیت کو اپنا مظہر قرار دیا اور وہ مظہر سیدنا عیسیٰ المسیح ہے کیونکہ صرف وہی اس طریق سے دنیا میں آیا ہے۔ اس قسم کے طریق ظہور کا نام معجزانہ پیدائش ہے۔ اسلام معجزہ کا قائل ہے اوراس لئےاس معجزانہ تولید کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ جیسا ہم آگے بیان کرینگے پر اسلام میں آج کل ایسے ارباب بھی پیدا ہوئے ہیں جو معجزات کے مطلق نہیں۔ یہ نیچری کہلاتے ہیں اور قانون قدرت اور فطرت کی عادت کے مستقل ہونے کے ماننے والے اوراس پر تاکید اس حد تک کرنے والے ہیں کہ معجزات کی گنجائش کو کافور کردیتے ہیں۔ ان کے نزدیک معجزات خلاف قانون قدرت ہے اورچونکہ قانون قدرت کے خلاف کچھ ہو نہیں سکتا لہذا معجزات غیر ممکن ہے ۔ ہم اس موقعہ پر معجزات کے امکان پر مفصل بحث نہیں کیاچاہتے ہیں پر نیچریوں کی خاطر اتنا ضرور عرض کیا چاہتے ہیں کہ معجزات قانون قدرت کے خلاف نہیں ہوتے پرایک نئے قانون اور نئے عالم کےموجود ہونے کے گواہ ہیں۔ اس مادّدی عالم کے علاوہ جس کا انتظام قانون قدرت کے موافق ہوتا ہے۔ ایک اور عالم بھی ہے جو روحی اور غیر مادّدی عالم ہے جس کا انتظام روحی قانون کےموافق ہوتا ہے ۔ جب ایسے قوانین کا ظہور اس عالم پر ہوتا ہے تو وہ مقابلہ اس عالم کے قانون قدرت کے فوق العادی کہلاتے ہیں۔ اس فوق العادی قانون سے جو کچھ ہوتا ہے وہ معجزہ کہلاتا ہے ۔ پس معجزہ قانون قدرت کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ اس

سے برتر ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کی پیدائش مرد سے ہوتی۔ اگر کوئی مرد بچہ جنتا تو یہ بات قانون قدرت کے خلاف ہوتی پر مسیح کی پیدائش میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی ہے اور اسلئے یہ پیدائش فطرت کے قانون کے خلاف نہیں پر اس سے برتر اور اعلیٰ قانون کا ظہور ہے۔

سائنس اس پیدائش سے تو ناواقف ہے پر اس قسم کی پیدائش سے ناآشنا نہیں۔ علم الحیات Biology اس طرح کی تولید کا ذکر اس خلقت کے ادنیٰ طبقے میں کرتا ہے۔ اس کی اصلاح میں اس طریق کی پیدائش کا نام پارتھینو جینس Parthenogeosis ہے اور اس لفظ کے معنی پیدائش ازباکرہ ہے۔ اس کے معلم یہ بیان کرتے ہیں کہ حیوانات اور نباتات کے طبقے میں اس قسم کی پیدائش ہوا کرتی ہے اور اس کی ایک مثال شہد کی مکھیاں ہیں جو صرف مادہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس بیان سے ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ مسیح کی معجزانہ پیدائش کو قانون قدرت کے دائرہ میں لے آئیں ۔ ہر گز نہیں پر صرف غرض یہ ہے کہ اس قسم کی پیدائش کے یقین لانے پر سائنس مزاحمت نہیں کرسکتی بلکہ وہ غیر متعصب شخص کی مدد کرتی ہے کہ ایسے ماجرہ کو قابل یقین سمجھے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا تولید حیات کے معمولی قاعدہ کو ادنیٰ طبقے کی مخلوقات کی پیدائش کے وقت گاہ بگاہ توڑ سکتا ہے تو کیوں وہ کسی خاص موقعہ پر خاص غرض سے خلقت کے اعلیٰ طبقے میں اس معمولی قانون کو برطرف نہیں کرسکتا؟

اسلام اور مسیح کی معجزانہ پیدائش ۔ قرآن مسیح کی معجزانہ پیدائش کا قائل ہے گو اس واقعہ کا بیان بعینہ انجیل مقدس کے موافق نہیں پھر بھی حضرت محمد ﷺ اور اس کے پیروؤں اس کے قائل ہیں کہ مسیح کنواری مریم سے پیدا ہوا اور نیز اس کے بھی کہ کنواری مریم کو کسی مرد نے نہیں چھوا بلکہ خدائے قادر نے اپنی قدرت سے مقدس مریم صدیقہ کو یہ شرف عطا کیا کہ وہ مسیح کی ماں ہو۔ اس کا مفصل بیان سورہ آل عمران اور سورہ مریم میں سنایا گیا ہے۔ وہاں جس کا جی چاہے کھول کر دیکھ لے۔

قرآن اس واقعہ کا بیان تو کرتا ہے پر اسکے کنہ سے بالکل بے خبر اور غیر مانوس ہے۔ سیدنا مسیح کی معجزانہ پیدائش ہی کا صرف قائل ہونا کافی نہیں پر ان نتائج پر جو اس مقدمہ سے صادر ہوتے ہیں غور کرنا ہر اہل فکر اور ہر اہل کتاب کا فرض ہے۔ اسلام اس مقدمہ سے تو واقف ہے پر ان نتائج سے بالکل ہی غافل ہے۔ اب ہم ان کی طرف اسلام کو متوجہ کیا چاہتے ہیں۔

۱ ۔ تولید کا معمولی قاعدہ کسی نئے شخص کے وجود کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے کوئی بالکل ہی نیا انسان اس جہان میں خلق کیا جاتا ہے جو قبل اپنی پیدائش دنیا میں معدوم تھا۔ اب سیدنا مسیح کی پیدائش تولید کے معمولی قاعدہ سے اسی لئے نہیں ہوئی کہ وہ قبل اپنی ولادت موجود تھا۔ سیدنا مسیح نے خود اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ میں اس جہان میں مولود ہونے سے پیشتر بھی موجود تھا چنانچہ اس نے ایک موقعہ پر یہودیوں سے یہ کہا کہ " تمہارا باپ ابراہیم میرا دن دیکھنے کی امید پر بہت خوش تھا چنانچہ اس نے دیکھا اور خوش ہوا ۔ یہودیوں نے اس سے کہا

کہ تیری عمر تو ابھی پچاس برس کی نہیں پھر تونے ابراہیم کو کس طرح دیکھا؟ سیدنا مسیح نے ان سے کہامیں تم سے سچ سچ کہتا ہوں پیشتر اس کے کہ ابراہیم پیدا ہوا میں ہوں"۔ ایک اور مقام پر سیدنا مسیح نے خدا سے مخاطب ہو کر یہ دعا کہ " اے باپ تومجھے اپنے ساتھ اس جلال سے جو میں دنیا کی پیدائش سے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا جلالی بنادے اے باپ میں چاہتا ہوں کہ جنہیں تونے مجھے دیاجہاں میں ہوں وہ بھی میرے ساتھ ہوں تاکہ میرے اس جلال کو دیکھیں جو تونے مجھے دیا ہے کیونکہ تونے بنائے عالم کے پیشتر مجھ سے محبت رکھی ۔(انجیل یوحنا باب ۱۸ اور آیت ۵۸۔ اور باب ۱۷ اور آیت ۵ اور ۲۴ کو دیکھو)۔

۲۔ دوسرا نتیجہ جو سیدنا مسیح کی معجزانہ پیدائش سے صادر ہوتا ہے اس کی عصمت ہے ۔جس وقت کنواری مریم کے پاس جبرئیل فرشتہ ولادت مسیح کی بشارت لایا اس وقت اس نے اس بات کا بھی اعلان سارے جہان سے کردیا کہ چونکہ روح القدس تجھ پر یعنی مبارک مریم پر نازل ہوگا اور خدا تعالیٰ کی قدرت کا سایہ اس پر ہوگا اس لئے وہ جو پیدا ہونے والا ہے قدوس کہلائیگا اس مقام سے صاف ظاہر ہے کہ ربنا المسیح کی معجزانہ تولید کا نتیجہ اس کی عصمت ہے۔

جس وقت خدا نے آدم کو پیدا کیا اس نے اس کو معصوم پیدا کیا پر وہ شجر ممنوعہ کے کھانے سے گنہگار ہو گیا۔ اس نے اپنی عصمت کھودی اب اس عصمت کے بحال کرنے کے لئے خدا نے آدم ثانی کو پیدا کیا یہ آدم ثانی سیدنا مسیح ہیں۔ قرآن نے بھی اس کا یہ مرتبہ قائم رکھا ہے اور اس کو کمثل آدم بنایا ہے۔ ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب۔ ذرا اہل اسلام اس موقع پر خیال کریں کہ کس اعتبار سے عیسیٰ کمثل آدم ہوسکتا ہے۔ کیا خلقہ من تراب کے اعتبار سے یہ بات تو صحیح نہ ہوگی کیونکہ خدا نے آدم کے مثل عیسیٰ کو تراب یعنی مٹی سے پیدا نہیں کیا۔ پھر وہ اس کے مثل ہے تو کس اعتبار سے کیا صرف اس اعتبار سے نہیں کہ مثل آدم کے وہ معصوم پیدا ہوئے افسوس کہ آدم اول معصوم تو پیدا ہوئے پر معصوم بنے نہ رہے ۔ سیدنا مسیح معصوم پیدا ہوئے اور معصوم بنے بھی رہے تاکہ بنی آدم کو معصوم بنائے۔

مسیح کی عصمت کی شہادت قرآن اور حدیث ہر دو قسم کی کتب سے دی جاسکتی ہے۔ قرآن نے اس کو مس شیطان سے پاک بتایا ہے چنانچہ سورہ آل عمران میں انی سمیتہا مریم وانی عیذھا باک وذرتہیا من الشیطان رحیم کا مطلب یہی ہے کہ مریم اور اسکی اولاد یعنی مسیح قبل تولید شیطان مردود سے اللہ کی پناہ میں سونپے گئے اور اس آیت کی تفسیر میں محمد ﷺ کا یہ قول بھی ہے جو صحیح حدیث میں منقول ہے مامن مولود یولدا الاشیطان ہمسہ حین ولید فیستہل صارخاً من مسن الشیطان ایاہ الامریم وانہا۔ یعنی کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اس کو چھو لیتا ہے شیطان پیدا ہوتے وقت پس وہ چلاتا ہے چیخ کر اس کے چھونے سے مگر مریم اور اس کا بیٹا۔

اسلام مسیح کو معصوم تو مانتا ہے پر معجزانہ پیدائش کی بنا پر نہیں۔ اس لحاظ سے وہ دین عیسوی کا ساتھ نہیں دیتا۔اس کے عقیدہ کے موافق سارے انبیاء معصوم تھے۔ اس کا کہنا گویا یہ ہے کہ سب دھان بائیس پسیری ہے پر عصمت

انبیاء کا مسئلہ قرآن کی روح سے باطل ہے کیونکہ اس میں اکثر انبیاء کے گناہ کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی ایسے جو اسلام میں اولوالعزم کہلاتے ہیں مثلاً آدم اور ابراہیم اور موسیٰ اور محمد پر اس فہرست سے عیسیٰ مستثنیٰ ہے۔ قرآن میں کسی مقام پر لفظ ذنب مسیح سے منسوب نہیں کیا گیاہے۔ وہی اکیلا قرآن کا معصوم نبی ہے۔

مسیح کی معجزانہ پیدائش کی غایت نہایت ہی غور طلب ہے آدم کی پیدائش کے بعد تناسل کی تولید کا ایک قانون جاری کردیا گیا تھا اوراب تک وہ قانون فی زمانہ جاری بھی ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ ہر بچہ کی پیدائش مرد اور عورت کے اجتماع سے ہوتی ہے۔ یہی تولید تناسل کا فطرتی انتظام اور قانون ہے۔ اب اس قانون کے ملتوی کرنے اورایک خاص شخص کی تولید کے لحاظ سے اس کو برطرف کرنیکی کوئی اشد ضرورت ضرور آن پڑی ہوگی ورنہ یہ کار محل ٹھہریگا جو خدا تعالیٰ کی شان کے لائق نہ ہوگا۔قرآن اس غایت سے ہمیں خبردار نہیں کرتا پر انجیل سے یہ غایت معلوم ہوجاتی ہے اور وہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ خدا نے غیر معمولی اور فوق العادی طریق سے اس لئے مسیح کو پیدا کیا کہ عصمت مجسم کا ظہور دنیا میں ہواور خدا کے قدس کا ایک زندہ فوٹو ہمارے پاس آجائے۔

۳۔ تیسرا نتیجہ جو مسیح کی معجزانہ پیدائش سے صادر ہوتا یہ ہے کہ اس کی تولید سے اس دنیا کی تواریخ میں ایک نئی انسانیت شروع ہوئی ۔ مسیح اس نئی انسانیت کی ابتدا اور انتہا ہے۔ وہی اس کا سرچشمہ اورمنبع ہے۔ اس نئی انسانیت کا خاصہ وہ روحانی حیات اور الہیٰ قدرت ہے جس کی مثال اس دنیا میں آج تک نہ دیکھی نہ سنی گئی تھی۔آدم سے جو انسانیت کا سلسلہ جاری ہوا اس قسم کا نہیں تھا۔ وہ حیات حیوانی تھی۔ وہ حیات نفسانی تھی پر مسیح کی انسانیت نے روحانی اورالہیٰ حیات کا چشمہ اس جہان فانی میں جاری کیا اور حیات جاودانی سے بنی آدم کو مستفیض فرمایا۔ اس حیات کے چشمہ سے انسان کی پرانی عادت اور بُری خصلت اور شیطانی سیرت بدل کر نئی ہوجاتی ہے۔ وہ نیا مخلوق بن جاتاہے ۔ وہ نجات یافتہ ہوتاہے ۔یہی باعث ہے کہ سیدنا مسیح نجات دہندہ ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے ایک نئی انسانیت جو گناہ سے پاک ہے شروع ہوتی ہے۔

سیدنا مسیح کے دعوےٰ ۔ہم نے اس امر کا ذکر اوپر کیا ہے کہ مسیح قبل از تولید مریم موجود تھے اوراس کا اظہار طریق ظہور اور نیزہ خود مسیح کے قول سے ہوتاہے۔ اس دعویٰ کے علاوہ سیدنا مسیح کے اور بھی دعوےٰ ہیں جن سے وہ مظہر اللہ ثابت ہوتاہے مثلاً اس نے خدا کے برابر ہونے کا دعوےٰ کیا اور یہ فرمایا کہ" میں اور باپ ایک ہیں (انجیل یوحنا ۱۰ باب کی ۳۰آیت)یہودی اصطلاح میں باپ سے مراد خدا تعالیٰ ہے اور مسیح بموجب اس قول کے خدا کے ساتھ ایک شئے ہونے کے مدعی ہیں۔ اس وقت کے سامعین نے بھی اس قول کا مطلب یہی سمجھا کہ وہ ذات الہیٰ میں خدا کے ساتھ ایک ہے۔ "وہ خدا میں اور خدا اس میں (یوحنا باب ۱۰آیت ۳۸)۔

" باپ مجھ میں اور میں اس میں" کیا مسیح صوفی تھا؟ ہر گز!اس کی تعلیم خدا کو ہمہ اوست کے موافق سب میں اور سب کو خدا میں نہیں بتاتی ہے۔ وہ یہ

ہر گز نہیں سکھاتا ہے کہ ساری چیزیں خدا ہیں وہ خدا کی شخصیت کا سخت قائل تھااور اس کو باپ کرکے بیان کرتا تھا۔۔۔۔۔ وہ سارے آدمی کے مخلوق ہونے اور خدا سے جدا ہونے کا بھی قائل تھا اور اس لئے انسان کو خدا نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ پس اس کا یہ دعویٰ کہ باپ مجھ میں اور میں اس میں ہوں صوفی رنگ سے علیحدہ ہے۔ وہ تصوف کے اعتبار سے نہیں اور نہ ہمہ اوست کے اعتبار سے یہ دعویٰ کرتا ہے کیونکہ حق تو یہ ہے کہ تصوف اور ہمہ اوست کی الوہیت کوئی الوہیت نہیں ہے۔ اگر خدا کائنات ہے اور کائنات خدا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شئے خدا ہے یعنی کوئی شئے خدا نہیں ہے۔

مسیح مظہر اللہ ہے پر مظہریت کے کسی ادنیٰ اعتبار سے نہیں وہ مظہر اللہ اس معنی میں نہیں ہے جس معنی میں سارے مخلوق مظہر اللہ ہیں۔ وہ انسانی نیکی اور خوبی کے اعلیٰ ظہور کے اعتبار سے مظہر اللہ نہیں ہے اور نہ اس اعتبار سے کہ الہیٰ نعمت اور بخشش سے وہ بہت ہی بہترین طریق سے معمور اور مملو تھا۔ عابد اور مومن اس حجت سے مظہر اللہ خیال کئے جاتے ہیں کہ ان کی روح پر خدا کا سایہ رہتا ہے اور وہ خدا کے ساتھ ارتباط اور التفات پیدا کرتی ہیں پر میں وہ بشر! مسیح کی مظہریت اس قسم کی مظہریت سے بالکل نرالی ہے۔ اس کی مظہریت ازلی ہے پر مخلوقات کی مظہریت ازلی نہیں ہے۔اس کی مظہریت اصلی ہے پر مخلوقات کی مظہریت کسی ہے۔ اسکی مظہریت اکمل ہے پر مخلوقات کی مظہریت ناقص ہے اسی لئے یہ کہنا بجا ہے کہ مسیح کی مظہریت اس کی الوہیت ہے اور عابد اور مومن کی مظہریت اس کی بشریت پر دال ہے۔!

مسئلہ اوتار اور مظہر اللہ۔ عموماً مسلمان مسیح مظہر اللہ کا بیان سنکر ہندوؤں کے اوتاروں کاذکر کرنے لگتے ہیں اور اس تعلیم کو ہندوخیال سے تعبیر کرتے ہیں۔ مسئلہ اوتار اور مظہر اللہ کی تعلیم میں بادی النظر توکچھ موافقت معلوم پڑتی ہے پر فی الحقیقت آسمان زمین کا فرق ہے۔ ان کا ذکر مختصراً یہ ہے۔

فرق اول۔ مسئلہ اوتار کسی انسان کو اللہ بناتا ہے پر مسئلہ مظہریت اللہ کی ذات اور صفات کو انسانیت کے دائرہ میں ظاہر کرتا ہے۔ اوتار وہ شخص ہے جو شروع میں معمولی انسان ہے پر کسی خاص خوبی کے لحاظ سے خدا تک بلند کردیا جاتا مثلاً ہندوؤں کے اوتار رام کو لیجئے۔ وہ شروع میں بادشاہ ہے جو بڑا ہی فرمانبردار اور اپنے والدین کا پیارا ہے۔ پھر جنگ میں غنیم رامن کو قتل کرنے اور مظلوم کو رہا کرنے کے لحاظ سے بہادر گنا جاتا۔ لوگ اس کی تعریف کرتے اورآخر ش اس کی پرستش ہونے لگتی۔ وہ جو معمولی انسان تھا اب اوتار قرار دیا جاتا ہے۔ مسئلہ مظہریت اللہ عین اس کے برعکس ہے۔ وہ کسی انسان کو خدا نہیں گردانتا پر خدا کو انسانیت میں دکھاتا ہے۔ مسیح انسان ہو کر خدا نہیں بنتا۔ یہ صریح کفر ہے۔ پروہ خدا ہو کر انسانیت میں ظاہر ہوتا ہے۔

فرق دوم۔ ہندوؤں کے خیال کے موافق اوتار خدا کے کسی نہ کسی جزکا ہوتا ہے وہ اس کا " انش" کہلاتا ہے پر مظہر اللہ الوہیت کے کمال کا ظہور ہے۔

مسیحی دین میں خدا کے جز کا خیال کفر ہے اور اس لئے مسیح خدا کا مظہر اکمل ہے جس میں الوہیت کا سارا کمال مجسم ہورہا ہے۔

فرق سوم۔ اسی لئے کہ ہندومذہب کے موافق اوتار خدا کے جز کا ہوتا ہے۔ اہل ہنود ایک اوتار کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے یہاں متعدد اوتار مانے گئے ہیں پر مسیحی دین کے اعتبار سے صرف سیدنا مسیح اکیلا اور نرالا مظہر اللہ ہے۔ خدا ایک اور اس کا مظہر بھی ایک ہی ہے۔

فرق چہارم۔ ہندوؤں میں حیوانات مثل سور اور کچھ اور بھی خدا کا اوتار مانا گیا ہے پر مسیحی دین میں خدا کا ظہور خلقت کے اعلیٰ اور افضل طبقے یعنی طبقہ انسانیت میں بیان کیا گیا ہے۔ صرف انسانیت میں خدا کے اوصاف کی قبولیت کا ملکہ ہے اور اس لئے وہ مظہر اللہ ہوسکتی ہے۔

فرق پنجم۔ ہندوؤں کے اوتاروں کواخلاقی صفات سے کچھ اُنسیت اور محبت نظر نہیں آتی۔ پر مسیح کی پاکیزہ اور معصوم زندگی دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔وہ فرشتوں سے بزرگتر ہے۔وہ انبیاء سے بزرگتر ہے۔وہ خلیل اللہ اور کلیم اللہ اور حبیب اللہ سے بزرگتر ہے کیونکہ وہ مظہر اللہ ہے۔

مسیح کلمۃ اللہ

"فی البوء کان الکلمۃ واکلمۃ کان عند اللہ وکان الکلمۃ اللہ۔ ترجمہ میں کلمہ اللہ تھا اور کلمۃ اللہ کے ساتھ تھا اور کلمۃ اللہ تھا (انجیل یوحنا)

إِذْ قَالَتِ الْمَلآئِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ترجمہ جب کہا فرشتوں نے اے مریم اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے کلمہ کی اپنی طرف سے کہ نام اس کا ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مرتبہ والا دنیا میں اور آخرت میں اور ہے مقربوں سے (آل عمران ۴۵)۔

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ترجمہ نہیں ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم۔ مگر رسول اللہ کے اور کلمۃ اللہ کے ڈالا اور کلمہ طرف مریم کے اور روح اللہ کی طرف سے (النسا ۱۷۱)ان آیات سے جن کو ہم نے نقل کی ہیں سیدنا مسیح کا کلمۃ اللہ ہونا ثابت ہے پر سوال یہ ہے کہ کلمۃ اللہ سے مراد کیا ہے ؟

۱ ۔ قرآن شریف اورانجیل مقدس دونوں سے ظاہر ہے کہ کلمۃ اللہ اسم ذات ہے نہ کہ اس صفات چنانچہ بقول انجیل اس کا ازل میں ہونا اور اللہ کے ساتھ ہونا اس کی دلیل کافی اور وافی ہے۔علیٰ ہذا القیاس قرآن کا یہ بیان کہ اس کلمہ کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہے اور نیز یہ کہ وہ مقدس مریم کی طرف القاء کیا گیا اس امر کو واضح کررہاہے کہ کلمہ اسم ذات ہے۔

۲۔ کیوں مسیح کلمۃ اللہ کہلاتاہے؟ قرآن کے مفسرین اس کی تشریح میں یہ فرمائے ہیں کہ چونکہ عام سبب ولادت عیسیٰ مفقود تھا اور وہ اللہ کے کلمہ سے بغیر کسی وسیلہ کے پیدا ہوئے لہذا کلمۃ اللہ کہلائے۔ ہمارے نزدیک یہ تاویل مرتبہ تحقیق سے گری ہوئی ہے۔ اگر مسیح کلمہ کن سے پیدا ہونے کے باعث کلمۃ اللہ ہے تو اس اعتبار سے آدم کو اس کا حق زیادہ تر پہنچتا ہے کیونکہ وہ نہ صرف بلا باپ بلکہ بلاماں ہی پیدا ہوئے تھے اور اس لئے بہتر معنی میں کلمۃ اللہ ہوسکتے ہیں پر نہ قرآن نے اور نہ انجیل نے آدم کو کلمۃ اللہ ہونے کا خطاب دیا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ مسیح کسی اور جہت سے کلمۃ اللہ کہلاتے ہیں۔

۳۔ لفظ کلمہ کی تحقیق ۔ اس تحقیق میں ہم قرآن شریف سے قطع نظر کرتے ہیں اورانجیل مقدس کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ اس لفظ کا اطلا اس شخص سے ہوا ہے جس کی پوری کیفیت صرف انجیل ہی میں مرقوم ہے مسیح کے اس نام کی تفسیر صحیح اور کامل بجز انجیل کے نہیں ہوسکتی ہے۔ انجیل کلمۃ اللہ کی مفتاح ہے جس طرح وہ لفظ مسیح اور شخص مسیح کی مفتاح ہے جس طرح قرآن کے مفسرین نے لفظ مسیح کے معنی بیان کرنے میں بغلیں جھا نکیں ہیں ۔ اسی طرح لفظ کلمۃ اللہ کے صحیح مفہوم بیان کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اور کوتاہی کیوں نہ ہو اس لفظ کی لغت انجیل شریف ہے۔ پس اس لفظ کلمۃ اللہ کے حقیقی معنی اور مطلب دریافت کرنے میں ہم انجیل کی طرف رجوع کرنا انسب جانتے ہیں۔

ہر شخص اس سے واقف ہے کہ انجیل کی اصلی زبان یونانی ہے اور اگر ہم کسی انجیلی لفظ یا انجیلی اصطلاح کی شرح کیا چاہیں تو ہمیں اصلی یونانی کی طرف رجوع کرنا پڑیگا اور لفظ کی ماہیت کا سراغ اصل زبان کی مدد سے لگانا پڑیگا۔ کلمۃ اللہ انجیلی اصطلاح ہے اور فی الحقیقت یونانی عبارت لوگوس کا عربی ترجمہ ہے۔ اس لفظ کے باریک مفہوم کا علم انجیل مقدس اوریونانی تصنیفات سے بخوبی حاصل ہوسکتاہے وہوہذا۔

لوگوس (کلمہ) یہ لفظ یونانی حکماء کی تصانیف میں آیا ہے چنانچہ حکیم افلاطون نے اس کا استعمال کیا اوراس کے معنی اس کی کتب میں عقل کے ہیں انگریزی لفظ لاجک بمعنی منطق اسی سے مشتق ہے۔ یہ مشہور فلاسفر سیاروں کی پیدائش کو اللہ کے کلمہ سےمنسوب کرتاہے۔ وہ اللہ کی عقل اورعلم کو لوگوس یعنی کلمہ بتاتا ہے۔

پھر یہ لفظ اسکندریہ شہر کے اہل علم میں مروج پایا جاتا اورخاص کر عالم وفاضل فائلو یہودی کی کتابوں میں ملتاہے۔ فائلو کبھی تو اس سے خدا کی قدرت

اور کبھی الہیٰ فہم مراد لیتا ہے۔ وہ خلقت کو بھی لوگوس کے نام سے یاد کرتا اور لوگوس تھیویعنی کلمۃ اللہ کو اللہ کی عقل یا ذہن خیال کرتا ہے۔

یہ بھی غور طلب امر ہے کہ یونانیوں نے لوگوس یعنی کلمہ کو ظاہر اور باطن ہر دو قسم پر تقسیم کیا تھا۔ چنانچہ حکیم ارسطاطالیس نے کلمہ ظاہر کو لوگوس پروفوریکس اور کلمہ باطن کو لوگوس اندیاتھتاس بتایا ہے۔ کلمہ باطن سے مراد عقل اور کلمہ ظاہر سے قوت نطق ہے۔

یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں بھی کلمۃ اللہ کا ذکر پایا جاتاہے۔ ان کے نزدیک بھی اللہ کا کلمہ اور اللہ کی حکمت یا عقل مترادف ہیں۔ چنانچہ سلیمان بادشاہ جو حکمت اور دانش میں یہودیوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا خوکما یعنی حکمت کی تعریف کرتا ہے اور یہودی علماء اس خوکما کو میمرا سے تعبیر کرتے ہیں جس سے کلمۃ اللہ مراد ہے۔ یہودیوں کی مشور کتاب ترگم میں میمرا یعنی کلمۃ اللہ سے خود اللہ تعالیٰ بھی مقصود ہے چنانچہ کتاب ترگم کا بیان ہے کہ وہ جو موسیٰ نبی پر ظاہر ہوا تھا میمرا یہواوہ یعنی کلمۃ اللہ تھا۔ ایسے اور مقامات بھی پیش کئے جاسکتے ہیں جن میں کلمۃ اللہ کا ذکر یہودی تصانیف میں آیا ہے۔ اس ترگم میں جس کا مصنف اونکلوس تھا یہ عبارت صرف توریت کے محدود ایرہ میں ڈیڑھ سو دفعہ سے کم نہیں آئی ہے۔ اس کثرت استعمال نے اس لفظ کو ہر دینی معلم اور مذہبی شخص کے دل میں جگہ دیدی تھی۔ کلمۃ اللہ کلمۃ اللہ کا لفظ ان کو پیارا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے فلسفیانہ اور دینی معنوں سے بالکل مانوس اور واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول یوحنا نے اس عبارت کو اپنی کتاب میں بغیر شرح کے درج کی ہے اس کی تعلیم جو کلمۃ اللہ کے باب میں ہے نہایت ہی عمیق اور غور اورخوض کے قابل ہے۔

انجیل میں کلمۃ اللہ کا ذکر۔

انجیل مقدس میں کلمۃ اللہ سیدنا مسیح کا اسم ذات ہے۔ قرآن اس کی تائید کرتاہے ۔ مسیح کا یہ نام ان ہر دو کتب میں آیا ہے اوراس کا مفصل بیان ازروئے انجیل یہ ہے۔

ا ۔ کلمۃ اللہ ازلی ہے۔ "ابتدا میں کلمہ تھا"۔ اس زندگی کے کلام کی بابت جو ابتدا سے تھا"۔ اول عبارت جویوحنا کی انجیل میں اور دوم عبارت اس کے خط اول میں موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب زمانہ اور وقت موجود نہیں تھا اس یوم ازل میں مسیح کلمۃ اللہ تھا۔ وہ وجود اللہ کے باطن میں اسی صورت سے تھا جس صورت سے انسان کی روح میں عقل انسانی موجود رہتی ہے گویا کلمۃ اللہ خدا کی ازلی عقل کا الہیٰ عکس ہے۔ اور جس طرح خدا کا خالی از عقل ہونا کسی زمانہ میں محال ہے اسی طرح کلمۃ اللہ کا کسی زمانہ میں نہ ہونا بھی محال ہے۔ اس مقام پر اس طرز بیان سے کلمۃ اللہ کے اسمِ ذات نہ ہونے کا خطرہ پیدا ہوتاہے ۔ کسی کے دل میں یہ شک آسکتاہے کہ کلمۃ اللہ محض اسم صفات ہے اوراس لئے وجود خدا میں موجودہے۔ اس شک کے دفعہ کرنیکی غرض سے یہ آیت اس کے ساتھ ہی ساتھ چسپاں ہے کہ " کلمہ خدا کے ساتھ تھا"۔

۲۔ الکلمۃ کان عنداللہ ۔ " کلمہ خدا کے ساتھ تھا"۔ اصل زبان یونانی کا مطلب نہ صرف یہ ہے کہ وہ اس کا بغلگیر تھا بلکہ یہ کہ کلمۃ اللہ اور اللہ میں رفاقت اور جگری اُنسیت اور اتحاد اور ارطبات تھی۔ اس کا رخ گویا ہمیشہ خدا کی رخ کی طرف تھا۔ پر اس بیان سے ایک نیاشک آکھڑا ہوتاہے اور وہ یہ ہے کہ کیا واحد خدا سے علیحدہ اوراس کی ذات سے خارج کلمۃ اللہ کا وجود ہے۔ اگر یہ حال ہے تو دو خدا ہوئے ایک اللہ خود اور دوسرا کلمۃ اللہ۔ اس شک کی گنجائش ہی مفقود کردینے کے لئے آیت یوں ختم ہوتی ہے کہ

۳۔" کان الکلمۃ اللہ ۔ اور کلمہ خدا تھا"۔ وہ جو زمانہ کے اعتبار سے ابتدا زمانہ تھا اوراپنے تعلق اور نسبت کے اعتبار سے اللہ کے ساتھ تھا اپنی ذات کے اعتبار سے اللہ ہی تھا۔

پس الہامی تقریر سے صاف معلوم ہوتاہے کہ کلمۃ اللہ کا مفہوم کیا کچھ ہے اور مسیح کس معنی میں کلمۃ اللہ ہونے کا حق رکھتاہے۔وہ مثل کلمہ یعنی عقل کے خدا کی ذات میں ازل سے ہے اور ازل ہی میں وہ مثل قوت نطق کے اللہ سے صادر ہوتاہے پر اس کا یہ صادر ہونا زمانہ ازل میں اللہ کی ذات کے گویا باطن میں ہوتا اوراس لئے وہ جو کلمۃ اللہ ہے اپنی ذات کے اعتبار سے خود اللہ ہے اوراسی لئے وہ اللہ کا کلمہ کہلاتاہے۔

پر کلمہ نہ صرف عقل ہے بلکہ وہ قوت ناطقہ بھی ہے جس کا ظہور اول ازلی اوراصلی اور باطن میں ہو کر خارج میں بھی ہوتا ہے اور اس خارجی ظہور کی دو صورتیں ہیں۔

اول۔ خلقت کی پیدائش ۔ خدا بذریعہ اپنے کلمہ کے اپنے سے خارج میں جب اپنے تئیں ظاہر کرتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مادہ اور ارواح موجود ہوجاتے ہیں " کن فیکون" " خدا نے فرمایا اور ہو گیا۔ اس لئے کلمۃ اللہ کی شان میں یہ آیت آئی ہے کہ ساری چیزیں اس کے وسیلہ پیدا ہوئیں اورجو کچھ پیدا ہواہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہ ہوئی خدا اس خلقت کو خلق کرکے ترک نہیں کردیتا بلکہ اپنا تعلق اس سے قائم رکھتاہے ۔ وہ آلہ اور ذریعہ جس سے یہ تعلق قائم رہتا بجز کلمۃ اللہ کے اور کوئی دوسرا نہیں ہے اور جس طریق سے یہ تعلق برقرار رکھا جاتا وہ یہ ہے کہ کلمۃ اللہ انسانیت کو اختیار کرتا اور انسانی جسم اورروح کو خدا کے اعلیٰ اور اکمل ظہور کا مسکن بناتاہے یہی وہ دوسری صورت ہے۔

دوم صورت۔ کلمہ مجسم ہوا اورا س نے فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان خیمہ کیا اور ہم اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا ایک اورآیت میں یوں مرقوم ہے اس زندگی کے کلام کی بابت جوابتدا سے تھا اور جسے ہم نے سنا اوراپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا اور اپنے ہاتھوں سے چھوا ۔ یہ زندگی ظاہر ہوئی اور ہم نے اسے دیکھا اوراس کی گواہی دیتےہیں اور اسی ازلی زندگی کی تمہیں خبر دیتے جو باپ کے ساتھ تھی اور ہم پر ظاہر ہوئی۔

کلمۃ اللہ کا یہ بیان انجیل کا انوکھا اور نرالا اور لاثانی بیان ہے ۔ تصور کے اس مرتبہ اور سچائی کے اس زینہ تک نہ تو یونانی فلاسفر پہنچے تھے اور نہ یہودی ربیوں اور فقیہوں نے قدم دھرا تھا۔ ان کے خیال میں لوگوس کلمۃ اللہ کا اسم ذات ہونا نہ آیا تھا۔ انہوں نے ذات الہیٰ کے باطنی اور خارجی ظہور کا ایسا صاف علم نہ پایا تھا۔ کلمۃ اللہ کا مجسم ہونا ، مظہر اللہ اور مظہر اللہ کا مقدس مریم کی طرف القماء کیا جانا ان کے ذہن سے کوسوں دور تھا۔ اس راز کا کھولنا انجیل ہی کے حصہ میں رکھا گیا تھا جس نے اس کلمۃ اللہ کو ازلی اور اللہ کی ذات کا باطنی عکس اور خارجی ظہور بتایا اور اس کو عمانوئیل یعنی خدا ہمارے ساتھ کی صورت میں روشن کردکھایا۔

فلسفہ نے خدا کو خلقت سے بہت ہی دور جا بٹھایا۔ دین یہود نے خلقت اور خالق کے مابین فرشتوں اور نبیوں کا خیال جمایا پر انجیل نے خدا کو خلقت سے باہم ملایا حتیٰ کہ فرشتوں اور نبیوں کی چنداں ضرورت نہ رہی مسیح کلمۃ اللہ خدا اور انسان کے درمیان حداوسط ہے۔ جس کا نتیجہ حیات اور محبت اور نجات ہے "خدا ایک ہے اور خدا اور انسان کے بیچ میں درمیانی بھی ایک ہے یعنی عیسیٰ مسیح"۔

بیان مذکورہ بالا سے یہ روشن ہوگیا کہ کلمۃ اللہ کے معنی کیا ہیں اور یہ بھی کہ مسیح کس معنی میں اللہ کا کلمہ کہلاتا ہے۔ المختصر وہ کلمۃ اللہ اسی معنی میں ہے کہ ازل سے خدا کی ذات پاک میں مثل عقل اور ذہن کے موجود ہے اور نیز اس معنی میں کہ مثل قوت نطق کے وہ ذات الہیٰ کے اسرار اور اوصاف الہیٰ کے راز کو اس عالم اسباب میں زمان اور مکان کی قید میں لا کر انسانی محاورہ اور لہجہ میں ادا کرتا ہے وہ الہیٰ زندگی اور خیالات کا لسانِ انسانی میں مترجم ہے اور اسی لئے اس کا نام کلمۃ اللہ ہے جیسا کہ یوحنا لاہوتی کا قول ہے کہ اس کی آنکھیں آگ کے شعلہ کی مانند اور اسکے سر پر بہت سے تاج اور اس کا ایک نام لکھا ہے جسے اس کے سوا کسی نے نہ جانا اور وہ خون میں ڈوبا ہوا لباس پہنے تھا اور اس کا نام کلمۃ اللہ ہے۔

باب ششم

ذات وصفات مسیح ازروئے انجیل مقدس

فان کنت فی شک مما انزلنا الیک فسئل الذین یقرون الکتب من قبلک۔

ترجمہ -اے محمد جو کچھ ہم نے تیری طرف نازل کیا اگر تجھے اس میں شک ہے تو ان سے پوچھ جو تجھ سے قبل کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اس آیت قرآنی میں شک کی دوا موجود ہے۔ اس میں حق کا وہ منبع مذکورہ ہے جو زمانہ سلف سے آج تک مسیحیوں کے پاس پایا جاتا ہے۔ اسی کا نام انجیل مقدس ہے اور اگر کسی محمدی کے دل میں سیدنا مسیح کی ذات وصفات کی نسبت شک پڑا ہوا ہے تو قرآن کی یہ آیت اس کو انجیل سے دریافت اور سوال کرنے کا حق دے رہی ہے۔ ہم ایسے

سائل کی خاطر انجیل کے ورقوں میں سے ربنا المسیح کی حقیقی اوراصلی صورت اور ذاتی سیرت کا بیان اخذ کرتے ہیں۔

باب پنجم میں ہم نے مسیح کلمۃ اللہ کا ذکر کیا اور کلمۃ اللہ کے صحیح مفہوم کو بیان کیا اور یہ دیکھا کہ کلمۃ اللہ درحقیقت انجیلی اصطلاح ہے اور مسیح کا یہ نام یوحنا رسول کا بتایا ہوا ہے ۔ہم اسی رسول کے منہ سے مسیح کی ذات کا بیا اور کچھ سنایا چاہتے ہیں۔ اس کلمۃ اللہ کی شان میں اس کا اول قول قابل غور یہ ہے۔

" ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسے باپ کے اکلوتے کا جلال "۔

اس آیت سے روشن ہے کہ مسیح میں خدا کا جلال ہے اور رسولوں اور نبیوں کے محاورہ میں خدا کا جلال خدا کے اوصاف کے مجموعہ اور کمال کا نام ہے پس ظاہر ہے کہ مسیح وہ شخص ہے جس میں خدا کی صفات اکمل طور سے موجود ہے۔

خدا کے اس جلال کا بیان یوحنا رسول نے تین صورتوں میں کیا ہے۔

اول۔ "خدا حیات ہے"۔ وہ خود اپنے آپ میں زندگی رکھتاہے " پر نہ صرف وہ اپنے ہی میں حیات رکھنے کی قوت رکھتا ہے بلکہ وہ دوسروں کو جو اس سے غیر ہیں حیات بخشتاہے۔ اسی لئے وہ خالق ہے۔

خدا کے جلال کی یہ صورت مسیح میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ میں قیامت اور حیات ہوں۔ انجیل یوحنا باب ۱۱ ایت ۲۵ جس طرح باپ یعنی اللہ اپنے آپ میں حیات رکھتاہے اسی طرح اس نے اپنے بیٹے کو یعنی مسیح کو بھی بخشا کہ اپنے آپ میں حیات رکھے باب ۵آیت ۲۶۔ پھر جس طرح خدا دوسروں کو حیات بخشتا ہے اوراپنے سے غیر اشیاء کو خلق کرتاہے اسی طرح مسیح بھی دوسروں کو حیات بخشتا یعنی خلق کرتاہے۔ ساری چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہواہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہ ہوئی باب ۱ آیت ۳۔

مسیح کا خالق ہونا قرآن سے بھی ثابت ہے۔ انی اخلق لکم من الطین کھئیتہ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ۔

اس آیت میں لفظ خلق کا اطلاق مسیح سے کیا گیا ہے ازروئے قرآن اس کا یہ دعویٰ ہے کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرند خلق کرتا ہوں اوراس میں پھونک مارتاہوں اور وہ پرند ہوجاتاہے اللہ کے حکم سے ۔ قرآن اور دین اسلام کے عقیدہ کے موافق خدا اور صرف خدا خالق ہے جن اورملک اورانسان سب مخلوق ہیں اور کسی درجہ اوراعتبار سے خالق نہیں ہوسکتے۔ قرآن صاف فرمارہا ہے ۔ لاَ يَخْلُقُ شَيْئاً وَهُمْ يُخْلَقُونَ اعراف ۱۹۱ ظاہر ہے کہ خالقیت معبودیت کی صفت ہے۔ اور کسی طور سے مخلوق کی صفت نہیں ہوسکتی ہے پر پھر بھی قرآن بڑی راستی سے مسیح کو خالق قرار دے رہا ہے اوراس صفت الہٰی کے اعتبار سے اس کو مخلوق سے اعلیٰ اورسارے رسولوں اور نبیوں سے افضل قرار دیتاہے۔ ہاں اس امر میں وہ اس کو خدا کے مشابہ بتاتاہے۔ دیکھو سورہ جن میں خدا فرماتاہے کہ انی خالق بشراً من طین فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی۔ اس آیت میں خدا کی نسبت اسی قسم کا بیان ہے جو مسیح کی شان میں اوپر کیا گیاہے خدا مٹی سے بشر کو خلق کرتاہے اور اس میں

حیات پھونک مارتا ہے جس طرح مسیح مٹی سے خلق کرتا اور اس میں حیات پھونک مارتا ہے ۔ یہ مشابہت عجیب وغریب ہے اوراپنا ثانی نہیں رکھتی ہے۔ اسلام کے بانی حضرت محمد ﷺ کو بھی یہ شرف حاصل نہیں ہوا اور نہ انہوں نے قرآن میں خلق کرنے کا دعویٰ کیا!

اکثر محمدی اس بیان کو ضعیف بنانے کی نیت سے باذن اللہ پر تاکید کیا کرتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ باذن اللہ کی قید کے ہم بھی قائل ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ساری چیزیں خدا نے مسیح کے وسیلے بنائیں۔ اللہ جو انجیل کی اصطلاح میں خدا باپ کہلاتاہے مسیح کے ذریعہ جو ابن اللہ اورمظہر اللہ اور کلمۃ اللہ اس دنیا کوخلق کرتاہے۔ یعنی قرآن کے محاورہ میں خلق کرنا" باذن اللہ ہے" ! سچ ہے صرف انجیل کی روشنی میں معماحل ہوتاہے ۔ قرآن اس کو رفع نہیں کرسکتا اس کا بیان تناقص پیدا کرتا ہے۔ اسلام اس کو مخلوق مانتا ہے اور پھر ازروئے قرآن وہ خالق بھی ٹھہرتا ہے۔ کیا یہ صریح تناقص نہیں ہے کہ ایک ہی شخص خالق اور مخلوق دونوں ہو؟ یا تو اس تناقص کو قبول کردیا مسیح کو خالق جان کر کم ازکم خدا کی صفات واجبی محل مانو اوراس کو خدا کے جلال اور کمال کا مظہر جانو۔

دوم۔" خدا محبت ہے"۔ رسول یوحنا کا اول خط باب ۴آیت ۸۔ خدا کی ذات کا یہ بیان نرالا اورانوکھا کسی اور دینی کتب میں نہیں ملتا ہے اسلام خدا کی رحمت کا ذکر تو بار بار کرتاہے پر رحمت محبت سے ادنیٰ یا یوں کہو کہ رحمت محبت کا صرف عکس ہے ۔ محبت خدا کی عین ذات ہے۔ اور وہی محبت مجسم سیدنا مسیح ہے۔ اس کی زندگی محبت الہیٰ کا مظہر ہے ۔ اس میں خدا کی محبت کا جلال درخشاں ہوتاہے۔ یہی محبت اس کو انسانیت اختیار کرنے پرآمادہ کرتی ہے۔ یہی محبت اسکو نعمت مغفرت بخشنے کی خاطر اپنی زندگی قربان کرنے پر مستعد کرتی ہے۔ یہی محبت اس کو قبر میں مردہ نہیں چھوڑدیتی ۔یہی محبت اس کو رفع آسمان کا شرف بخشتی ہے۔

سوم" خدا نور ہے" رسول یوحنا کا خط اول باب ۱آیت ۵۔ جس طرح سے یہ بیان آیاہے کہ خدا نور ہے اسی طرح سے یہ بیان بھی آیا ہے کہ مسیح نور ہے۔ مسیح کا دعویٰ یہ ہے کہ میں جہان کا نور ہوں باب ۸آیت ۱۲ ۔ قرآن نے بھی خدا کا بیان یوں کیاہے کہ وہ آسمان اورزمین کا نور ہے۔ اللہ نور السموات والارض (سورہ نور) اور مسیح انجیل میں بعینہ یہ دعویٰ کررہاہے کہ میں جہان کا نور ہوں نہایت ہی غور کا مقام ہے کہ اسلام کے نزدیک قرآن اورانجیل ہر دو کتاب ایک ہی سلسلہ کی ہیں ۔ دونوں ایک ہی مرتبہ کی ہیں گویا دونوں ایک ہی کل کے جز ہیں پس جو کبرا اور صغرا ان سے اخذ کرکے پیش کیا جاتا ہے اورجو نتیجہ اس سے نکلتاہے اس کے ماننے میں اسلام کو کیا تامل ہے!

رسول یوحنا کی ایک اور تصنیف ہے جس کا ذکر ہم نے اب تک نہیں کیا ہے اس کی یہ تصنیف مکاشفات کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں سیدنا مسیح کی ذات اور صفات کا ذکر آیا ہے اور وہ نہایت ہی غور طلب ہیں رسول یوحنا رویا میں مسیح کو آسمان پر دیکھتا ہے۔ یہ مسیح وہی مسیح مصلوب ہے جواب جلال میں بیٹھا

ہوا نظر آتا ہے۔ اس جلال میں سے مسیح یوحنا سے خطاب کرتا اوراپنی امت کو پیغام بھیجتا ہے۔ وہ اپنی ذات کا اظہار آسمان پر سے ان الفاظ میں کرتا ہے کہ میں الفا اور امیگا، اول اور آخر ہوں وہ جو ہے اور جو تھا اور جو آنے والا ہے یعنی قادر مطلق۔

قرآن کو جب ہم پڑھتے ہیں تو اس میں خدا کے ننا نوے ناموں میں سے دو نام ایسے ہیں جن کا اطلاق مسیح اپنی طرف کرتا ہے۔ وہ دو نام اول اور آخر ہیں۔ قرآن میں خدا کا ذکر آیا ہے کہ اول اور آخر اور ظاہر اور باطن ہے ھوالاول والاخر والظاہر والباطن (سورہ حدید ع ۱) انجیل میں مسیح فرماتے ہیں کہ میں اول اور آخر ہوں۔ اے ناظرین اب ان کبرا اور صغرا سے نتیجہ آپ خود ہی نکال لیں کہ مسیح کون ہے؟ کیا وہ صرف ایک نبی ہے؟ کیا وہ صرف ایک رسول ہے۔ یا کیا وہ ایسا شخص ہے جس میں ذات اور صفات الہیٰ کا ظہور ہوا جو اس معنی میں کلمۃ اللہ یا یہودی محاورہ میں ابن اللہ اور ابن وحید کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

پولوس رسول کی شہادت مسیح کی شان میں یوحنا رسول کی تعلیم میں دو خاص امور روشن طور سے بیان ہوئے ہیں وہ دو امور خدا تعالیٰ اور انسانی عالم ہیں یوحنا کے قول کے موافق مسیح وہ ازلی لوگوس ہے جو خدا کی ذات میں ہے اور پھر بھی اس سے صادر ہو کر علیحدہٰ وجود رکھتا ہے۔ وہی اس انسانی عالم میں نادیدہ خدا کے جلال کا دیدنی ظہور ہے اور یہ مظہر جس طرح خدا سے خارج ہے۔ اسی طرح اس کے باطن میں بھی موجود رہتا ہے۔ وہ خدا کے ساتھ ہے۔ وہ خدا ہے۔

پولوس رسول کی تعلیم میں تین امور روشن طور سے بیان ہوئے ہیں اول خدا کا بیان آیا ہے۔ دوم انسانی عالم کا اور رسوم خدا اور انسانی عالم کے مابین سیدنا عیسیٰ مسیح کا جو خدا اور انسان ہو کر خدا اور انسان کے بیچ ایک ہی درمیانی قرار پاتا ہے۔ اس سے ہر گز یہ غرض نہیں ہے کہ یوحنا رسول کے خیال میں مسیح انسان نہیں یا پولوس رسول کے ایمان میں مسیح خدا نہیں پر اس سے صرف یہ مطلوب ہے کہ ان دونوں رسولوں کی تعلیم میں صداقت کے یہ پہلو زیادہ تاکید کے ساتھ واضح طور سے بیان ہوئے ہیں۔

پولوس رسول بڑی تاکید سے سیدنا مسیح کی انسانیت کو پیش کرتا ہے اور اس لئے اس کی تصنیفات میں یہ ذکر آیا ہے کہ وہ عورت سے پیدا ہوا۔ وہ داؤد کی نسل سے تھا۔ وہ شریعت کا محکوم رہا۔ وہ فرمانبردار تھا بلکہ صلیب تک فرمانبردار رہا۔

اس انسانیت کے متعلق پولوس رسول دو خاص باتوں کو صراحتاً پیش کرتا ہے۔ اول یہ کہ مسیح کی انسانیت گناہ سے مبرا اور منزہ ہے ۔ اس کی انسانی روح اور جسم ہر دو بے گناہ تھا۔ اس اعتبار سے وہ جمیع انسان سے بالکل نرالا اور اکیلا تھا اور اسی لئے کہ وہ بے گناہ تھا وہ انسانیت کو اصلی پاکی اور نیکی اور راستی پر بحال کرنے کا ذریعہ ہے۔ انسانیت " مسیح میں " کامل ہوتی ہے کیونکہ مسیح کی انسانیت بے گناہ انسانیت ہے۔ دوم۔ مسیح کی بے گناہ انسانیت کی علاوہ پولوس رسول یہ بھی فرماتا ہے کہ اس کی انسانیت ہماری اور سارے بشر کی کی انسانیت کا لب

لباب اور مغز ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ مسیح کی انسانیت بعینہ وہ اصلی اور حقیقی انسانیت ہے جس کا تصور خدا تعالیٰ کے ذہن میں قدیم سے ہے گویا مسیح کی انسانیت اس اول انسانیت کا نقشہ ہے جو خدا کے ذہن میں شروع سے موجود تھا۔ اسی لئے وہ مسیح کو آدم ثانی بیان کرتا ہے کیونکہ اس کا مومنین سے وہی تعلق ہے۔

آدم اول البشر کا جمیع انسان سے ہے۔ اس جہت سے آدم اور مسیح میں نسبت تساوی ہے پر رسول اس کے علاوہ اس نسبت کا بھی بیان کرتا ہے جس کو نسبت بتائیں کہتے ہیں اور اس کے ضمن میں وہ یہ فرماتا ہے کہ آدم اول کا جسم فانی اور خاکی تھا پر آدم ثانی مسیح کا جسم غیر فانی اور آسمانی تھا (۱ کرنتھیوں ۱۵: ۴۷) آدم اول کی زندگی فطرت کے قانون کی پابند تھی پر مسیح فوق الفطرت تھا۔ آدم اول گنہگار انسان تھا اور اس کے گناہ کا اثر سارے بشر پر پڑا اور اسکی ساری اولاد گنہگار ہوئی پر مسیح آدم ثانی گناہ سے پاک تھا اور اسکی پاکی کی تاثیر سے سارے آدمی پاک بن جاتے ہیں۔ آدم اول کے ذریعہ بنی آدم میں موت آئی پر آدم ثانی مسیح کے ذریعہ اس فانی عالم میں زندگی آئی۔

رسول مقبول کی اس ساری تقریر کا نتیجہ نہایت ہی غور طلب ہے۔ اس کے نزدیک سیدنا مسیح آدم ثانی اور ساری انسانیت کا وکیل اور کفیل اور اسکی اصل اور اس کا نجات دہندہ ہے۔ یہ نتیجہ خود ہی کہہ رہا ہے کہ وہ جو اس مرتبہ کا انسان ہو محض انسان ہی انسان ہو نہیں سکتا ؟ وہ ضرور انسان سے بڑھ کر ہے تو کیا وہ خدا ثانی ہے ؟

اس لئے سوال کے جواب کے سمجھنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا نہایت ہی ضرور ہے کہ پولوس رسول موحد تھا۔ وہ خدا کی وحدت کا بہت ہی بڑا قائل تھا۔ وہ اس مسئلہ پر عاشق تھا۔ اس کے نزدیک خدا مخلوق سے جدا تھا۔ وہ خدا کو خالق جانتا تھا اور اس کے خیال میں ساری خلقت خدا سے اور خدا ہی کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ اس لئے وہ بےدینی کا نام " لغو" بتاتا تھا کیونکہ بے دینی نے خدا کے جلال کو خلقت کی چیزوں سے بدل کر خدا کی وحدت کو برباد کردیا تھا۔ اسی لئے وہ خدا کی شان میں یہ فرماتا تھا کہ خدا مبارک اور واحد حاکم بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوند کا خداوند ہے۔ بقا صرف اسی کو ہے اور وہ اس نور میں رہتا ہے جس تک کسی کی گذر نہیں ہوسکتی ۔ نہ اسے کسی انسان نے دیکھا اور نہ دیکھ سکتا ہے اس کی عزت اور سلطنت ابد تک رہے آمین۔

پولوس رسول سخت موحد تھا۔ پھر بھلا سیدنا عیسیٰ کا مرتبہ اس کی نگاہ میں کیا کچھ ہے؟ وہ محض انسان تو ہو نہیں سکتا پر اگر وہ انسان سے اعلیٰ اور افضل ہے تو کیا ہے ؟ اس کے دو ہی جواب ہوسکتے ہیں اول یا تو وہ مخلوق ہے یا دوم وہ ذات الہیٰ کے باطن میں موجود ہے۔

پولوس رسول کے خیال میں سیدنا مسیح کا تعلق اور رشتہ مابین خلقت تین طرح پر ہے۔ اول۔ ساری چیزیں آسمان یا زمین کی دیدنی یا نادیدنی ہاں فرشتوں کے بھی سارے مراتب خواہ تخت یا ریاستیں یا مختار یاں سب کی سب مسیح میں

پیدا ہوئیں " مسیح میں پیدا ہوئیں "۔ اس سے رسول کی غرض یہ ہے کہ خلق کرنے کی قوت مسیح سے علیحدہ اور اس سے خارج میں موجود نہیں تھی۔ وہ خالق بلقوہ ہے۔

دوم۔ ساری چیزیں مسیح سے پیدا ہوئیں "۔

وہ قدرت جس سے یہ دنیا نیست سے ہست کی گئی مسیح سے صادر ہوئی اور وہی اس عالم کا خالق بالفعل بھی ہے۔

سوم۔ ساری چیزیں مسیح کے لئے پیدا کی گئیں "۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسا ادنیٰ خالق نہیں جو کسی اور کے لئے خلق کرے۔ نہیں ۔ وہ اپنے ہی لئے خلق کرتا ہے۔ وہ ساری چیزوں کا منبع اور علت فاعلی اور علت غائی بھی ہے اور اسی لئے رسول نے اس کی شان میں یہ بھی فرمایا ہے کہ وہیعنی مسیح سب چیزوں سے پہلے اور اسی سے ساری چیزیں قائم رہتی ہیں ۔(خطِ کلسیوں باب اول آیت ۱۷)۔

پس ظاہر ہے کہ مسیح مخلوق نہیں بلکہ مخلوقات سے مقدم اور نیز مخلوقات کا خالق ہے۔ وہ درحقیقت وہ شخص ہے جو مخلوقات میں ظاہر ہونے سے پیشتر موجود تھا۔ کہاں پر ؟ کیا خلقت میں ؟ نہیں ۔ ورنہ خود بھی مخلوق ہی ٹھہرتا۔ پھر کہاں پر؟ ذات الہیٰ کے باطن میں کیونکہ وہ رسول کے بیان کے موافق نادیدہ خدا کی صورت ہے۔

رسول کا قول یہ ہے۔ پس ویسا ہی مزاج رکھو جیسا عیسیٰ مسیح کا تھا جس نے خدا کی صورت پر ہو کر خدا کے برابر رہنے کو قبضے میں رکھنے کی چیز نہ سمجھا بلکہ اپنے آپ کو خالی کردیا اور خادم کی صورت پکڑی اور انسانوں کے مشابہ ہوگیا ۔(نامہ فلپیوں باب ۲ آیت ۶ ، ۷)۔

اس قول میں سیدنا عیسیٰ کی بابت دو باتیں بتائی گئیں ہیں اول اس کی حیات کا بیان کیا گیا ہے جو خادم کی صورت اختیار کرنے کے قبل تھی۔ اس حیات اور طرز زندگی کو خدا کی صورت بتایا ہے رسول نے جس زبان میں ان الفاظ کو ادا کیا وہ یونانی تھی اور اس زبان میں جو لفظ صورت کے لئے استعمال ہوا لفظ" مورفے" ہے۔ رسول کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے لفظ " مورفے" کو سمجھنا ضروری ہے اور اس لئے ہم اس کی مختصر تفسیر یہاں درج کرتےہیں " مورفے تو تیہو"

مورفے۔ صورت ۔ یونانی فلسفہ کی کتابوں میں مورفے لفظ کا ذکر ملتا ہے۔ افلاطون فلاسفر نے اس لفظ سے ذات اور ماہیت مراد لی ہے ۔ ارسطو کی تصنیفات میں اس لفظ کا ذکر اکثر آیا ہے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ ساری اشیاء کی تقسیم دو اصول پر کافی ہے۔ اول ہیولا جو اشیاء کے اوصاف کا محل اور ظرف ہے۔ دوم۔ صورت جو سارے اوصاف کا مجموعہ ہے۔ اس صورت کو وہ یونانی زبان میں " مورفے" کہتا ہے۔

پولوس رسول نے اس لفظ کو مسیح کی شان میں استعمال کیا وہ اس لفظ سے ان کی ذات اور ماہیت مراد لیتا ہے اور اس کو خدا کی صورت بتاتا ہے یعنی وہ مسیح کو ایسا شخص قرار دیتا ہے جس میں خدا کی ذات اور صفات کا مجموعہ موجود تھا۔ مسیح کی اصلی حیات یہی ہے وہ ازل سے اوصاف الہیٰ کا محل ہے اور اس لئے خدا کی صورت

ہے پر وہ جو فی الحقیقت خدا کی صورت ہے وقت معین پر انسان کی صورت اختیار کرتا ہے یا یوں کہو کہ الہیٰ حیات اور الہیٰ صفات کو انسانیت کے اختیار کرنے سے اس عالم پر ظاہر کرتا۔

رسول مسیح کی شان میں ایک اور مقام پر یہ فرماتاہے کہ" وہ نادیدہ خدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے"(کلسیوں کونامہ باب اول آیت ۱۵)۔

اس مقام پر جو یونانی لفظ صورت کے لئے آیا ہے وہ " ایکون" ہے۔اس لفظ کے مفہوم میں تین باتیں شامل ہیں اول اس میں مشابہت کا خیال ہے۔ مسیح خدا کی صورت ہے یعنی وہ خدا سے مشابہت رکھتاہے اس معنی میں کہ وہ ذات الہیٰ کے باطن میں موجود ہے اور یوں اس کی اور خدا کی شبیہ ایک ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ اس کی اور خدا کی ذات ایک سی ہے۔ دوم۔ اس لفظ میں عکس کا خیال پایا جاتاہے اسی لئے بادشاہ کی وہ صورت جو سکون پر پائی جاتی "ایکون" کہلاتی ہے۔اسی لئے آفتاب کا عکس جو پانی پر پڑتا ایکو ن کہلاتا۔ اسی لئے پتھروں کی صورتیں ایکون کہلاتی تھیں اور نیز فرزند اپنے والدین کے ایکون کہلاتے تھے آخر الذکر مثال بہت ہی قابل غور ہے اور مسیح کی ماہیت کے سمجھنے میں نہایت ہی مفید ہے۔ مسیح خدا کی صورت اسی معنی میں ہے۔

زمانہ ازل میں جب خلقت معدوم ہے وہ فی الحقیقت ذات الہیٰ کے باطن میں خدا کا ازلی وابدی عکس ہے ۔ پر جو باطن میں خدا کی صورت یعنی اس کا ازلی عکس ہے خارج میں ظاہر بھی ہوتاہے اوریہی وہ تیسرا خیال ہے جو لفظ ایکون میں موجود ہے۔ وہ خدا کی صورت یعنی خدا کا مظہر ہے ۔ خدا نادیدہ ہے۔ اس کی ذات ادراک سے پوشیدہ ہے پر وہ نادیدہ خدا اپنی صورت یعنی اپنے مظہر کے ذریعہ سے اپنی پوشیدہ ذات اور صفات کو مخلوقات پر روشن کرتاہے ۔ یہ مظہر اللہ چونکہ اللہ کی ذات سے صادر ہوتاہے اور صادر ہو کر خلقت پر ظاہر ہوتاہے اسی لئے مولود کہلاتاہے۔ اس ظہور کی دوصورتیں ہیں اول زمانہ کے قبل ازل میں اور اس اعتبار سے وہ ساری خلقت سےپہلے مولودہے دوم زمانہ یعنی وقت معین پراور اس اعتبار سے رسول نے یہ فرمایاکہ الوہیت کا سارا کمال اس میں مجسم ہورہا (کلسیوں کو نامہ باب دوم آیت ۹) اورایک اور مقام پر کیسا صاف بیان آیاہے کہ دینداری کا بھید بڑا ہے وہ جسم میں ظاہر ہوا۔ روح سے راست ٹھہرایا گیا۔ فرشتوں کو نظر آیا۔ غیر اقوام میں اس کی منادی ہوئی ۔ دنیا میں اس پر ایمان لائے اورجلال میں اٹھایا گیا (۱ تیمتھیس باب ۳آیت ۱۶)۔

مسیح ملائک کا مسجود۔ اس مضمون پر ایک رسول کی بحث ہمارے ہاتھ لگی ہے اوراس رسالہ کا نام "عبرانیوں کو خط" ہے اس نامہ میں دین یہودا ور دین نصاریٰ کا تقابل پایا جاتاہے۔ اس میں دین یہود کے مشائخ اور دین عیسوی کے مسیح کا مقابلہ کیا گیا ۔اور وہ ارسطو پر کہ ارکان دین ناظرین کے سامنے پیش کئے گئے اور مسیح سے جو نفس دین ہے اور ادنیٰ ثابت ہوئے مثلاًاہل یہود کہانت کی فضیلت کے قائل اس لئے مصنف نےہارون سردار کاہن اور مسیح کا مقابلہ کردکھایا اور یہ

ثابت کردیا کہ مسیح اس سے بزرگترین ہے۔ اسی طرح اہل یہود انبیاء کے قائل تھے اور موسیٰ کلیم اللہ پر بڑا فخر کرتے تھے لہذا مصنف نے یہ ثابت کیا کہ مسیح جملہ انبیا سے افضل تھا چنانچہ اس نے یہ فرمایا کہ وہ موسیٰ سے اس قدر زیادہ عزت کے لائق سمجھا گیا جس قدر گھر بنانے والا گھر سے زیادہ عزت دار ہوتاہے۔ موسیٰ تواس کے یعنی خدا کے سارے گھر میں خادم کی طرح دیانتدار رہالیکن مسیح بیٹے کی طرح اس کے گھر کا مختار ہے اوراس کا گھر ہم ہیں۔

اسی ضمن میں یہ بھی بیان آیا ہے کہ انبیا کا پیغام اور الہام حصہ بہ حصہ اورطرح بہ طرح آیا۔ خدا نے اگلے زمانہ میں نبیوں کی معرفت باپ دادؤں سے یوں ہی کلام کیا پر اس زمانے کے آخر میں ہم سے بیٹے کی معرفت اس میں ہو کر بولا گویا مصنف کا کہنا یہ ہے کہ مسیح سارے انبیاء کا عطر اورلب لباب ہے۔ وہ کل ہے اورانبیاء صرف جزہیں۔ پرانبیاء اورکہانت کے تقابل کے علاوہ مصنف نے مسیح کا مقابلہ فرشتوں سے کیا اوروجہ اس کی یہ ہے کہ اہل یہود فرشتوں پر نازاں تھے اوران کو خدا اورانسان کے بیچ درمیانی سمجھتے تھے۔ علماء یہود نے اس امر پر بڑی تاکید کی تھی کہ شریعت فرشتوں کے ذریعہ سے دی گئی اور اس لئے ان کی بزرگی قابل قبول ہے۔ انبیا اورکہانت کی فضیلت کے جواب میں یہودی یہ کہہ سکتا تھا کہ مسیح اگر کاہن سے اورانبیا سے بزرگتر ہے تو کیا ہوا وہ فرشتوں سے توادنیٰ ہے کیونکہ وہ توانبیاء اورکاہن کے موافق انسان نہیں پر محض ارواح ہیں اوراس لئے مسیح اور انبیاء اورکاہن تینوں سے وہ بزرگترہیں۔ اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیاہے کہ مسیح جس طرح کاہن اور انبیاء سے بزرگ ہے اسی طرح وہ ملائک سے بھی بزرگترین ہے۔ وہ فرشتوں سے اسی قدر بزرگ ہوگیا جس قدر اس نے میراث میں ان سے افضل خطاب پایا کیونکہ فرشتوں میں سے اس نے کب کسی سے کہا تومیرا بیٹا ہے آج تومجھ سے پیدا ہوا اور پھر یہ کہ میں اس کا باپ ہونگا اوروہ میرا بیٹا ہوگا اورجب پہلوٹھے کو دنیا میں پھرلایا توکہتاہے کہ خدا کے سب فرشتے اسے سجدہ کریں اور وہ اپنے فرشتوں کو ارواح اوراپنے خادموں کو آگ کا شعلہ بناتاہے پر بیٹے کی بابت فرماتاہے کہ اے خدا تیرا تخت ابدالاباد رہیگا اوریہ کہ اے خداوند تونے ابتدا میں زمین کی نیوڈالی اور آسمان تیرے ہاتھ کی کاریگری ہے۔ پھر اس نے فرشتوں میں سے کسی کے بارہ میں کب کہا کہ " تو میرے دہنی طرف بیٹھ جب تک میں تیرے دشمنوں کو تیرے پاؤں کے نیچے کی چوکی نہ کردوں"۔

اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح فرشتوں سے بزرگتر یوں ہے کہ فرشتے خادم ہیں جونجات یافتہ کی خدمت کرتے پر مسیح نجات کا بانی اور انکا خداوند ہے فرشتے ملک ہیں پر مسیح ان کا مالک ہے۔ فرشتے ارواح ہیں پر مسیح ابن اللہ ہے اس کی فضیلت اس میں ہے کہ وہ خدا کے جلال کی رونق اوراس کی ذات کا نقش ہے۔ مسیح کی شان میں یہ بیان جوآیاہے نہایت غور اور شرح طلب اوراس لئے مختصراً عرض کیا جاتاہے۔

مسیح خدا کے جلال کی رونق اوراس کی ذات کا نقش۔

خدا کے جلال سے کیا مراد ہے؟ خدا کے جلال سے کوئی نور یا روشنی مراد نہیں پر توریت اور زبور اورانبیاء کی کتب میں جلال الہیٰ سے الہیٰ اوصاف کا مجموعہ مراد ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ خدا کا جلال خدا کی ذات ہے جس میں جمیع اوصاف الہیٰ متمکن ہیں۔ مسیح اس جلال یعنی اس ذات کی رونق ہے۔ یونانی زبان میں رونق کے لئے لفظ اپوگیسما آیاہے۔ عالم یہودی بنام فائلو نے اس لفظ کو اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔ اپوگیسما جلال کا شعاع ہے جواس جلال سے صادر ہوتاہے ۔ وہ شعاشمس ہے۔ اس اعتبار سے مسیح خدا کی ذات کا مظہر قرار پاتا ہے۔ وہ اس نور سے صادر ہوتاہے ۔ وہ اس نورمیں ہے اوراس سے صادر ہو کر اس نور کو ظاہر کرتاہے یعنی وہ خدا کی ذات میں ازل سے موجود ہے اوراسکی ذات اور صفات کو مثل شعاع آفتاب کےمنور کرتااورہم پر روشن کرتاہے۔ اس لئے مسیحی کلمہ میں مسیح کی شان میں یہ بیان آیاہے کہ " وہ تمام عالموں سے پیشتر مولود خدا سے خدا ۔ نور سے نور حقیقی خدا سے خدا " سیدنا مسیح کا یہ بیان اس کے اس خارجی تعلق کو بتارہاہے جو مسیح کو خدا سے ہے باقی رہااس کا باطنی تعلق وہ آیت مذکورہ کے دوسرے جملے سے واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ مسیح خدا کی ذات کا نقش ہے یعنی جو کچھ خدا کی ذات میں ہے وہ اس کے نقش میں بھی ہے ۔ گویا مسیح خدا کی ذات کی چھاپ ہے۔ خدا نادیدہ ہے پر مسیح اس نادیدہ خدا کی ظاہرہ صورت ہے۔

مسیح کے خدا کے جلال کی رونق اوراس کی ذات کا نقش ہونا اس کو کہانت اور نبوت اور نیز ملایک پر فضیلت دے رہا ہے اس لئے وہ ملائک کا مسجود بیان کیا گیاہے۔

قرآن میں ملائک کے سجدہ کرنیکا ذکرآیا ہے پر اس کے بیان کے موافق ان کا سجود آدم ہے۔ واذ قلنا للملئکۃ اسجدولادم فسجدوا الاابلیس ابی واستکبروکان من الکفرین ۔ انجیل اور قرآن کے بیان کو پڑھ کر یہ خیال گذرتاہے کہ قرآن نے کس قدر سجدہ کی گت بنائی ہے۔ قرآن کا خدا غیر خدا کا سجدہ کراتاہے۔ وہ انسان کے سجدہ کا یہاں حکم دے رہا ہے پر انجیل کے موافق ملائک کا سجود کوئی انسان یا انسان کا باپ نہیں پرانسان کا خالق اور ذات الہیٰ کا مظہر مسیح خود ہے جو قبل ازل قبول انسانیت فرشتوں کا سجود ہے مسیح رسولوں کا سجود اورمعبود ہے۔ سیدنا مسیح کی حیات میں عوام الناس اس کی سجدہ کرتے تھے چنانچہ انجیل میں ذکرآیا ہے کہ جب وہ اپنی والدہ کی گود میں تھا مشرق سے چند نجومی اس کی زیارت کوآئے اورانہوں نے آکر اس کو سجدہ کیا۔ پھر مبروص جواسکے دست شفا سے فیض اٹھایا چاہتا تھا اس کی سجدہ بخوشی کرتا تھا۔ علی ہذا القیاس رسول پطرس نے سجدہ میں گر کر اس سے اپنی خاکساری اور گنہگاری کا اقرار کیا تھا اوراسی طرح مسیح کے زندہ ہونے پر مریم مگدلینی اوردیگر عورتوں نے اسکا سجدہ کیا۔ جب مسیح آسمان پر جاتے تھے اس وقت شاگردوں نے اس کو سجدہ کیا اور بڑی خوشی سے واپس آئے مسیح کے رفع آسمان بعد مومن اس کی عبادت کرتے تھے اور اسی لئے ان کا لقب" الذین یدعون

باسمک" پڑگیا یعنی وہ اسکے نام سے دعا کرتے ہیں۔ جس وقت استفینس شہید ہوتا تھا اس وقت اس نے مسیح سے دعا کی کہ " اے مولا عیسیٰ میری روح کو قبول کریں "پھر رسول پولوس نے اکثر اس سے دعا کی مثلاً اس نے اپنی جسمانی بیماری کے لئے تین مرتبہ دعا کی جس کا جواب یہ ملا کہ میرا فضل تیرے لئے کافی ہے۔ آسمان کی عبادت کا جو نقشہ یوحنا کی مکاشفات کی کتاب میں دکھایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ مومن کی جماعت اور سارے انبیا اور تمام خلقت اسی مسیح مصلوب کی عبادت میں مصروف اور مشغول ہیں۔ جو تخت پر بیٹھا ہے اس کی اور برہ کی حمد اور عزت اور تمجید اور سلطنت ابدالآباد رہے اور چاروں جانداروں نے آمین کہی اور بزرگوں نے گر سجدہ کیا۔ اس نہایت ہی مختصر سے بیان نے یہ امر روشن کردیا کہ انجیل مسیح کو رسولوں اور نبیوں اور عالموں کا معبود اور مسجود بتارہی ہے۔

انجیل میں سجدہ۔ نہایت ہی غور کا مقام ہے کہ انجیل میں سجدہ کا حق صرف خدا ہی کا بیان کیا گیا ہے۔ مسیح نے خود اس ازلی سچائی کا اظہار اپنی زبان سے کیا اور بوقت اپنی آزمائش شیطان سے یہ فرمایا کہ " تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" یہ بھی غور طلب امر ہے کہ جب کسی نے کسی بشر کو تعظیماً سجدہ کیا تو فوراً اس نے اس حرکت کو بیجا قرار دے کر اس نے منع کیا مثلاً جس وقت کرنیلیس فوج کے افسر نے رسول پطرس کو سجدہ کیا تھا اسی وقت رسول نے اس کو اس حرکت سے روکا۔ علی ہذا القیاس جب لسترہ شہر کے لوگ رسول پولوس اور برنباس کو دیوتا خیال کرکے قربانی چڑھایا چاہتے تھے تو انہوں نے بھی ان کو منع کیا کہ تم یہ کیا کرتے ہو۔ حق تو یہ ہے کہ ازروئے انجیل انسان کا کیا ذکر فرشتہ کو سجدہ کرنا منع ہے چنانچہ جس وقت یوحنا رسول نے فرشتہ سے الہیٰ پیغام پایا اس وقت وہ اسکے قدموں پر سجدہ کرنے کو گرا۔ فوراً فرشتہ نے اس سے کہا خبردار ایسا نہ کر۔ خدا ہی کو سجدہ کر۔ ان بیانات سے سجدہ کا انجیلی مسئلہ صاف ہوگیا اور وہ یہ ہے کہ ازروئے انجیل صرف خدا ہی کا سجدہ جایز ہے۔ نہ انسان نہ فرشتگان کو اس کا حق ہے اب اسی انجیل میں جس نے اس قدر صاف اور واضح طور سے خدا کو اور صرف خدا ہی کو معبود بتایا ہے سیدنا عیسیٰ مسیح کے مسجود ہونے کا ذکر بھی آیا ہے۔ پس روشن ضمیر شخص اس سے کیا نتیجہ نکال سکتا ہے ؟ منطق اس کبریٰ اور صغریٰ سے کیا نتیجہ نکالتی ہے ؟ ہماری عقل ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم یہ اقرار کریں کہ مسیح انسان اور بشر سے مرتبہ میں زیادہ ہے۔ کہ وہ رسول اور نبی سے بزرگتر ہے۔ کہ وہ ملائک اور ساری مخلوقات سے بزرگترین ہے وہ مظہر اللہ ہے اس لئے وہ ملائک کا مسجود ہے۔ اس لئے وہ رسولوں اور نبیوں کا معبود ہے۔

ہمارے اس بیان نے اسلام کے ایک بڑے اعتراض کو دفع کردیا ہے کہ اکثر مسلمان مسیح کے مظہر اللہ ہونے پر یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ مسیح مظہر اللہ ہے تو کیا ہوا۔ علاوہ مسیح اور بھی تو مظہر اللہ ہیں۔ ساری خلقت مظہر اللہ ہے۔ مسیح ہی کی کیا خصوصیت ۔جناب من۔ خصوصیت صاف ظاہر ہے۔ وہ مظہر اللہ ہو کر عبادت اور سجدہ کا حق رکھتا ہے اور اس اعتبار سے صرف وہی اللہ کا مظہر ہے۔ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں ان سے اللہ کا خیال دل میں آتا ہے۔ اس کی کسی صفت کا پتہ لگتا ہے پر

خدا کی کوئی صفت اس شئے میں موجود نہیں ہے۔ مصنوعات سے صانع کا علم توضرور ہوتاہے۔ کاریگری سے کاریگر کا ثبوت ہوتاہے پر صانع مصنوعات میں نہیں اور کاریگری میں نہیں اس لئے مصنوعات اور مخلوقات مظہر اللہ ہر گز ہر گز نہیں ہوسکتے اوراسی لئے وہ نہ مسجود ہیں اور نہ معبود ہیں۔ سیدنا عیسیٰ مسیح کا مظہر اللہ ہونا بالکل نرالامعاملہ ہے وہ اس لئے مظہر اللہ ہے کہ الوہیت کا سارا کمال ابن میں مجسم ہورہا۔ خدا کی صفتیں اس میں متمکن تھیں اور اسی لئے وہ قابل سجدہ تھا۔

باب ہفتم

مسیح ابن اللہ

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ (قرآن)

وصوت من السموات قائلاً هذا هوا بنی الحبیب الذی بہ سررت (انجیل)

ہم نے سیدنا عیسیٰ کی ابنیت کی بحث تثلیث کے متعلق کی ہے اس باب میں کچھ اور زیادہ مفصل اس اوق مضمون پر غور کرنا انسب معلوم ہوتاہے کیونکہ مسیح کی ابنیت کا مسئلہ اسلام اور دین مسیحی کے مابین حدفاصل ہے۔ اسلام اسی مسئلہ کے باعث دین مسیحی سے اتحاد اورارتباط کاروادار نہیں۔ اسی مسئلہ نے ہم پر اسلام اور قرآن کی جانب سے کفر کا فتویٰ جاری کردیاہے۔ لہذا ہم اول تصورابنیت کی تحقیق ازروئے قرآن کیا چاہتے ہیں۔

تصورابنیت اور قرآن۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ قرآن میں مسیح کے ابن اللہ ہونے کا انکار صاف الفاظ میں آیا ہے۔ دیکھو کیسا صاف کہاہے لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَآلُواْ إِنَّ اللّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ (سورہ مائدہ آیت ۷۱)۔اس کے منع کرنے کی وجہ کیا ہے؟ کیا قرآن نے کماحقہ ابن اللہ کے صحیح مفہوم کو سمجھا تھا؟ کیا ابنیت کا صحیح تصور قرآن کو حاصل تھا؟ ہم افسوس کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہر گز ہر گز نہیں۔ جس معنی میں قرآن نے ابن اللہ کی تردید کی ہے اس معنی میں ہم مسیحی بھی قرآن کی داد دیتے اوراس پر صاد کرتے ہیں۔ ذرا اس کو آپ غور سنیں۔ دیکھئے اسلام کی پیدائش اور پرورش کا زمانہ کتنی صفائی سے یہ روشن کررہاہے کہ وہ تصور ابنیت جو قرآن کے ذہن میں ہے وہ فلسفانہ اور غیر مادی تصورابنیت نہیں ہے بلکہ یہ وہ تصور ہے جو بت پرستی سے رنگا اور جس پر صنم پرستی کا ردا جما ہوا ہے۔ وہ زمانہ جس میں اسلام کا نشوونما ہوا بت پرستی کا زمانہ تھا۔ عرب بجز مسیحیوں اوریہودیوں کے بالکل بتوں پر عاشق تھا حضرت محمد ﷺ کے اباؤاجداد بھی بت پرست تھے ہاں حضرت خود بھی اسی بت پرستی کی ضلالت میں مبتلا تھے۔ قبل از دعویٰ رسالت انکی یہی حالت تھی۔ قرآن اسی حالت کو ضالا کے لفظ سے یاد کررہاہے اور تفسیر عزیزی ووجوک ضہالا فھدی کی شرح میں صاف کہہ رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بالغ ہونے کے بعد کمال عقل اوردانائی کے سبب سے اس قدر معلوم ہواکہ بتوں کی پوجا اور کفر وجاہلیت کی رسمیں سب بے اصل اور پوچ ہیں تو دین حق کے کھوج اور تلاش کے درپے ہوئے اور بڑے

بوڑھوں کی زبان سے سنا کہ ہمارا اصل دین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے آنحضرت کو یہ خیال بندھا اور تدبیر سوچی کہ حضرت ابراہیم کی طرح خدا کی طرف پورا رجوع ہوجاؤں اور اس کی عبادت اور بندگی کروں۔ لیکن جب دین ابراہیمی نہ کسی کو دیا رہا تھا اور نہ کسی کتاب میں لکھا ہوا تھا اور نہ آنحضرت کتاب پڑھ سکتے تھے بالضرور اس دین کے احکام کی کھوج اور تلاش کرنے میں بے قرار ہو کر تسبیح تہلیل اعتکاف جنابت کا غسل حج کے مناسک ادا کرنے اور خلوت اور گوشہ نشینی سے اور اسی نوع کے اور دوسرے امورات سے جس قدر معلوم ہوا اسی قدر مشغول رہتے تھے اس وقت تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے ان کو پاک دین کے اصول پر مطلع فرمایا اور آگاہ کیا اور اس پاک دین کے فروعات بہت اچھی طرح سے ان کے لئے معین ومقرر فرمائے اس دم وہ ان کی بیقراری جو حق دین نہ پانیکے سبب رہتی تھی جاتی رہی گویا اپنی کھوئی ہوئی چیز پائی اور جس راہ سے چلا چاہتے تھے اور وہ راہ سوجھ پڑتی نہ تھی سو وہ راہ آپ کو دکھائی اس باعث اس راہ کے نہ پانیکے بیقراری کو راہ بھولنے سے نسبت دی یعنی ضالا فرمایا "۔ اس بیان سے واضح ہے کہ محمد ﷺ اپنے ملک کی بت پرستی سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور اسی لئے وہ اس کی تردید بخوبی کرسکتے تھے۔ اس بت پرستی کی صورت عموماً وہی تھی جو کل بُت پرستی کی ہوتی ہے۔ بت پرست واحد اللہ کے علاوہ اور معبود کا قائل ہوتا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ میں جنس کی قید لگاتا ہے اور چند معبود کو مذکر اور چند کو مونث قرار دیتا ہے عرب کی بت پرستی بھی اسی قسم کی تھی۔ ان میں نہ صرف دیوتا بلکہ دیوی کی بھی پوجا ہوتی چنانچہ ان کی مشہور دیوی لات والعزیٰ ومناۃ کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ بت پرستوں کا یہ بھی عقیدہ ہوتا ہے کہ دیوتا اور دیوی سے بچے پیدا ہوتے ہیں ۔ یہی عقیدہ عرب کے صنم پرستوں کا بھی تھا چنانچہ حضرت محمد ﷺ نے سورہ النجم میں ان بتوں کے بیان کے ساتھ یہ صاف فرمایا کہ " بھلا تم دیکھو تولات اور عزیٰ اور منات تیسرا پچھلا (یہ کیا چیزیں ہیں) کیا تمہارے لئے لڑکے اور اللہ کے لئے لڑکیاں ہیں"۔ علاوہ بریں قرآن کے پڑھنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عرب کے بت پرست ملائک کی بھی پرستش کرتے تھے اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ سورہ زخرف ۱۵ آیت میں آیا ہے۔ وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا یعنی اللہ کے لئے اللہ کے بندوں نے جز قرار دیا ہے یعنی بقول مفسرین قرآن فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا ہے۔ پھر اگلی آیت میں آیا ہے کہ أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ یعنی کیا اللہ نے اپنی مخلوق سے بیٹیاں اپنے لئے اختیار کیں جیسا کہ کفارہ کا زعم تھا۔ قرآن میں ابن اللہ کا یہی تصور پایا جاتا ہے۔ وہ بت پرستی اور ملائک پرستی کا ایک جز ہے اور اسلئے بالکل باطل ہے۔ چونکہ حضرت محمد ﷺ کو اور کسی ابنیت کا علم نہ تھا۔ انہوں نے مسیح ابن اللہ کو بھی انہیں بت پرستوں کے خیال کے موافق خدا کا جز سمجھا اور اس غلطی کی تردید کی۔ انہوں نے مسیح ابن اللہ کو بت پرستوں کے معبود کے زمرہ میں شامل کیا اور اس کو کفارہ کی بات کے مشابہ سمجھا ہے۔ ہمارے اس خیال کی تصدیق قرآن خود ہی کررہا ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّهِ وَقَالَتْ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّهِ

ذَلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِؤُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُواْ (سورہ توبہ ۳۰)
اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے مسیحی عقیدہ اور بت پرستوں کے قول اوران کی منہ کی بت کو ایک سا سمجھا اوراسی لئے مسیح کے ابن اللہ ہونے سے انکار کیا۔ سورہ زخرف کی ایک آیت بھی اس پر موئد ہے۔ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ(آیت ۵۷)۔قصہ یہ ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ نے بت پرستوں سے یوں فرمایا کہ تم اور تمہارے معبود سب ہمہ جہنم ہیں ابن العری نے کہاواللہ میں تم سے خصوصیت کرونگا۔ آپ عیسیٰ کو پیغمبر کہتے حالانکہ ان کو نصاریٰ پوجتے ہیں اورایسے ہی عزیز اورملائکہ کو۔ تواگر یہ سب دوزخ میں جائینگے توہم راضی ہیں کہ ہمارے معبود جائیں اسکے جواب میں حضور خاموش ہوئے اور کفار ہنسے اورچلانے لگے کہ آج جیت گئے (کبیر) اس بیان سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے خیال میں مسیح کا ابن اللہ ہونا ایسا ہی تھا جیسا کہ دیوی دیوتاؤں اور فرشتوں کا اللہ کے بیٹے بیٹیاں ہونااور نہ اس خاموشی کے کیا معنی ! جیسا گروویسا چیلا ! جس طرح حضرت محمد ﷺ نے مسیحیوں کے عقیدہ کے سمجھنے میں غلطی کی اسی طرح قرآن کے مفسرین اورعلماء اسلام بھی غلطی کررہے ہیں ۔ دیکھئے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی تفسیر میں مسیحیوں پر کیا الزام لگارہے ہیں ۔ آپ سورہ اخلاص کی تفسیر کرتے وقت یہ فرماتے ہیں کہ باطل مذہب والے دنیا میں پانچ فرقے ہیں پہلا فرقہ دہریہ کا ہے جوکہتے ہیں کہ اس عالم کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے کسی طرح سے یہ اسباب جمع ہو کر یہ کارخانہ بن گیا۔ دوسرا فرقہ فلاسفہ کا ہے جوکہتے ہیں کہ عالم کا پیدا کرنے والا تو ایک ہے مگر کوئی صفت نہیں رکھتا یعنی جو تاثیریں کہ عالم میں پائی جاتی ہیں دے کسی سبب سے ہیں نہ اس ذات واحد سے اور حقیقت میں ہندوؤں کا مذہب بھی یہی ہے اور جب مسلمان نے اللہ کی لفظ کو جب سب کمال کی صفتوں کی جامعیت پر دلالت کرتی ہے منہ سے نکالا تو اس فرقہ کے عقیدہ سے خلاص حاصل کی۔ تیسرا فرقہ ثنویہ کا ہے جوکہتے ہیں کہ سب عالم کا پیدا کرنے والا ایک نہیں ہوسکتا اس کو کئی پیدا کرنے والے چاہیئں اورجب مسلمان آدمی نے احد کے لفظ کو اللہ تعالیٰ کی صفتوں سے جانا تو اس شرک سے نجات پائی ۔چوتھا فرقہ گمراہوں کا اہل کتاب سے جیسے یہود اور نصاریٰ اعتقاد رکھتے ہیں کہ عالم کا پیدا کرنے والا دوسرے مخلوقات کی طرح سے جورواور اولاد بھی کرتا ہے ۔چنانچہ عزیراور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوحق تعالیٰ کے بیٹے اور حضرت مریم کو جوروکہتے ہیں اورجب مسلمان آدمی نے لم یلد ولم یولد کہا تو اس عقیدہ سے پاک ہوگیا اوراسی طرح سے ہیں وہ تشبین جو یہود اور نصاریٰ نے باری تعالیٰ کی جناب میں ایجاد کی ہیں اوراس جناب کودوسرے مخلوقات کی طرح سے چیزوں کا محتاج جانتے ہیں سوان تشبیہوں کی روکےواسطے صمد کے لفظ جو تمام احتیاج کی نفی پر دلالت کرتی ہے کافی ہے " اے ناظرین !ہم پھر بتکرار عرض کرتے ہیں کہ یہ عقیدہ جس کا ذکر مولانا صاحب کررہے ہیں اور جو قرآن کی معلومات پر تراشا گیا ہے ہر گز ہر گز مسیحی ایمان اور نصاریٰ کا عقیدہ نہیں ہے۔ کون مسیحی مریم کو اللہ کی جوروکہتاہے ؟ کون مسیحی عیسیٰ کو دوسرے مخلوقات کی طرح خدا کا بیٹا کہتاہے ؟

دوسرے مخلوقات کی طرح ، یہ جملہ شاہ صاحب ہی کا ہے اور غور طلب ہے! جس معنی اور اعتبار سے ہم مسیح کو ابن اللہ کہتے ہیں وہ ان سے پاک ہے۔ اس کی تشریح ہم کچھ تو پہلے بابوں میں کر آئے ہیں اور کچھ یہاں اور زیادہ واضح طور سے کردیتے ہیں۔

تصور ابنیت اور کتب سماوی

اس مقام پر کتب سماوی سے یہودیوں اور مسیحیوں کی کتابیں مقصود ہیں۔ کتب یہود یعنی توریت اور زبور اور انبیاء کی تصانیف میں ابن اللہ کا ذکر موجود ہے اور قوم یہود اس خیال سے بالکل مانوس ہے چنانچہ ان کی کتب میں خاص تین طور سے اس نسبت اور اضافت کا بیان آیا ہے۔

اول خدا تعالیٰ تمام قوم یہود کو اپنا ابن اقرار دیتا ہے اور اسی لئے اسرائیل خدا کا بیٹا اور ابن وحید کہلاتا ہے (خروج باب ۴ آیت ۲۲ اور ۲۳)۔

دوم قوم یہود کے قاضی جو خدا کے نام سے انصاف کرتے اور گویا اس کے وکیل تھے ابن اللہ کہلاتے ہیں (زبور کی کتاب ۸۲ زبور آیت ۶)۔

سوم فوق العادی اشخاص مثل فرشتگان اور مومنین بھی ابن اللہ کہلاتے ہیں(کتاب ایوب باب اول آیت ۱۶ اور کتاب پیدائش باب ۶ آیت دوسری)۔

انبیا کی تصانیف میں مسیح ابن اللہ کہلاتا ہے مثلاً دانیل کی کتاب کے باب ۱۳ اور آیت ۲۵ میں صاف لکھاہے کہ نبوکدنظر بادشاہ کے حکم سے تین شخص آگ کی جلتی ہوئی بھٹی میں ڈالے گئے اور جب بادشاہ ان کو دیکھنے گیا تو اس نے یہ فرمایا کہ دیکھو میں چار شخص کھلے ہوئے آگ کے بیچ پھرتے دیکھتا ہوں اور چوتھے کی صورت خدا کے بیٹے کی سی ہے۔

ابن اللہ کے علاوہ عبری زبان میں ایسے محاورے بھی ہیں جن سے لفظ ابن کا اطلاق اور استعمال ظاہر ہوجاتاہے ۔ مثلاً پولوس کے نامہ تھسلینکیوں کے باب ۲ آیت آیت ۳ میں دجال کو ابن الھلاک کہاہے اور انجیل یوحنا میں یہوداہ اسکریوطی کو جس نے مسیح کو گرفتار کرایا اسی نام سے بیان کیا ہے پھر اہل شرارت عبری محاورہ میں بنی بلیعل یعنی بلیعل کے بیٹے کہلاتے تھے پہلا سیموئیل باب ۱۰ آیت ۲۷۔ علیٰ ہذا القیاس وہ شخص جو قابل سلامتی سمجھا جاتا تھا عبری محاورہ میں ابن السلام کہلاتا تھا انجیل لوقا باب ۱۰ آیت ۶ ۔

ابن السبیل۔ زبان عربی میں بھی ایسے محاورے پائے جاتے ہیں جن سے یہودی محاورات کے سمجھنے میں آسانی ہوسکتی ہے چنانچہ قرآن میں ابن السبیل آیا ہے جس کے لغوی معنی راہ کا بیٹا ہے پر جس سے مسافر راہ کا چلنے والا مراد ہے(سورہ بقرع ۲۲)۔

اس ساری تقریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابن اللہ درحقیقت یہودیوں کی دینی اصطلاح ہے اور ایک خاص نسبت اور مفہوم کے ادا کرنے وضع کیا گیا ہے اور اس لئے اس کے لفظی معنی پر تاکید نہیں کی جاتی ہے بلکہ مجازاً اس کو بیان کیا

ہے۔ اور حقیقت اس کی صدور اور ظہور ہے جو ذات باری تعالیٰ کو ہر طرح سے عقلاً اور نقلاً زیبا ہے۔

کیا مسیح نے ابن اللہ ہونے کا دعویٰ کیا ؟

ہم اس کے جواب میں ناظرین کی توجہ اس مقدمہ کی طرف پھیر لایا چاہتے ہیں جو پلاطوس کی کچہری میں ہوا۔ جب پیشی ہوچکی اور گواہ گذر چکے اور وہ قابل سزار نہ ٹھہرا تو پلاطوس نے کہا کہ میں اس کا کچھ قصور نہیں پاتا۔ یہودیوں نے جواب دیا کہ ہم اہل شریعت ہیں اور شریعت کے موافق وہ قتل کے لائق ہے کیونکہ اس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا بنایا۔ اس کے قبل جس وقت مسیح کی روبکاری یہودیوں کی پنچایت کے آگے ہوئی تھی اس وقت سردار کاہن نے اس سے قسمیہ یہ دریافت کیا کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ سیدنا مسیح نے اس سے کہا تونے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کے دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھوگے۔

اس مقام سے ذیل کی باتیں ثابت ہیں۔

۱ ۔ مسیح نے ابن اللہ ہونے کا دعویٰ در حقیقت کیا۔

۲ ۔ اس دعویٰ کی بنا پر قتل کے لائق سمجھا گیا۔

۳۔ مسیح کے خیال میں وہ جو دانیل نبی کی پیشینگوئیاں کے موافق ابن آدم ہوگا چاہیے کہ وہ ابن اللہ بھی ہو۔

۴۔ اس مقام سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مسیح کس معنی اور اعتبار سے ابن اللہ ہے۔ وہ مثل یہودی بادشاہوں اور قاضیوں اور عابدوں کے ابن اللہ نہیں ہے ورنہ یہودی اس اعتبار سے اس پر قتل اور کفر کا فتویٰ نہیں لگاتے۔ وہ ان سے اعلیٰ معنی میں ابن اللہ ہے۔ وہ ذات باری تعالیٰ سے صادر ہو کر ظاہر ہوا ہے اور اس لئے ابن اللہ ہے اور پھر اسی خدا کے دہنے جا بیٹھا اور وہاں سے آسمان کے بادلوں پر آئیگا اور اس لئے وہ ابن اللہ ہے۔

مسیح مَـــالِكِ يَوْمِ الدِّينِ ہے۔

مسیح نے دعویٰ کیا ہے کہ میں دنیا کا منصف ہوں۔ اس دن بہتیرے مجھ سے کہیں گے اے مولا، اے مولا! کیا ہم نے آپ کے نام سے نبوت نہیں کی اور آپ کے نام سے بدروحوں کو نہیں نکالا اور آپ کے نام سے بہت سے معجزے نہیں دکھائے ؟ اس وقت میں ان سے صاف کہہ دوں گا کہ میری کبھی تم سے واقفیت نہ تھی۔ اے بدکارو میرے پاس چلے جاؤ۔(متی ۷ باب آیت ۲۲)۔

دنیا کے آخر میں ایسا ہی ہوگا ابن آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزوں اور بدکاروں کو اس کی بادشاہی میں سے جمع کریں گے۔ اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔ اس وقت دیانتدار اپنے پروردگار کی بادشاہی میں آفتاب کی مانند چمکیں گے۔ (متی باب ۱۳ آیت ۴۱ سے ۴۳)۔

اور وہ یعنی مسیح نرسنگے کی بڑی آواز کے ساتھ اپنے فرشتو کو بھیجیگا اور وہ اس کے برگزیدوں کو چاروں طرف سے آسمان کے اس سرے سے اس سرے تک جمع کرینگے (مقدس متی ۲۴ آیت ۳۱)۔

مسیح کا یہ دعویٰ لاثانی ہے۔ کسی نبی نے اس قسم کا دعویٰ ہرگز ہرگز نہیں کیا اور نہ کرنیکی تاب رکھتاہے۔ قرآن شریف میں مالک یوم الدین صرف خدا تعالیٰ کی شان میں آیا ہے ۔ دیکھو سورہ الحمد میں وہ رب العالمین اورمالک یوم الدین کہلاتاہے اورمعنی اس کے یہی ہیں کہ خدا دن جزا کا اور خداوند ہے اور بعض قاریوں نے مالک یوم الدین بھی پڑھا ہے یعنی دن جزا کا بادشا ہے۔ اس مصداق سیدنا مسیح ہر دواعتبار سے ہے۔ وہ قیامت کے دن کا خداوند ہے کیونکہ خدا تعالیٰ اسی ہی کے ذریعہ اس دنیا کی قیامت کرے گا۔ وہ روز قیامت کا بادشاہ بھی ہے کیونکہ تخت عدالت پر وہی بیٹھیگا اوردنیا کے سارے شہنشاہ اورانبیا زاوراولیا اس کے آگے دست بستہ کھڑے ہونگے ۔ رسول کا قول کتنا صحیح ہے کہ اس نے ایک دن ٹھہرایا ہے جس میں وہ راستی سے دنیا کی عدالت میں اس آدمی کی معرفت کریگا جسے اس نے مقرر کیا ہے اور اسے مردوں میں سے جلاکر یہ بات سب پر ثابت کردی ہے۔ رسولوں کے اعمال باب ۱۷ آیت ۳۱۔ قرآن کے اس بیان مالک یوم الدین کو اگرہم مسیح کے دعویٰ کے ساتھ مقابلہ کریں تو نتیجہ اہل فکر خود نکال لینگے! مسیح کا دعویٰ ہے کہ میں مالک یوم الدین ہوں اور قرآن کا بیان ہے کہ خدا مالک یوم الدین ہے اگر مسیح سچا ہے اوراس کا یہ دعویٰ سچا ہے تو بتائیے کہ پھر مسیح کون ہے؟ کیا وہ ابن اللہ نہیں ہے جس کے سپرد اللہ نے عدالت کا سارا کام کردیا ہے دیکھئے اس کا کہنا کیسا صاف ہے ۔ قول مسیح" کیونکہ جس طرح باپ مردوں کو اٹھاتا ہے اور زندہ کرتا ہے ۔ اسی طرح بیٹا بھی جنہیں چاہتاہے زندہ کرتا ہے کیونکہ باپ کسی کی عدالت بھی نہیں کرتا بلکہ اس نےعدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کیاہے تاکہ سب لوگ بیٹے کی عزت کریں جس طرح باپ کی عزت کرتے ہیں جوبیٹے کی عزت نہیں کرتا وہ باپ کے جس نے اسے بھیجا ہے عزت نہیں کرتا۔ یوحنا باب ۵ آیت ۲۳۔

حقا کان ھذا ابن اللہ (متی ۲۷: ۵۴)

باب ہشتم

مسئلہ کفارہ

مسئلہ کفارہ مسیحی دین کی جان ہے۔اس پر سارے مومنین کا ایمان ہے۔ مغفرت کا یہی انتظام اور الہیٰ سامان ہے لہذا ہم اول اس مسئلہ کی بنا اور حقیقت پر بحث کیا چاہتے ہیں ۔مسئلہ کفارہ کی بنیاد کیا ہے؟

اس کی بنیاد ایک تواریخی واقعہ ہے۔وہ مسیح کی موت ہے !

مسئلہ تجسم اور مسئلہ کفارہ کا تعلق اسی سے عیاں ہے۔ تجسم کی غرض کفارہ ہے۔ مسیح مظہر اللہ اس لئے انسانیت میں ظاہر ہوا کہ بنی آدم کے لئے اپنی جان دے اور قربان ہوجائے اور جمیع انسان کا گویا سر اور سردار ہو کر گناہ کی سزا یعنی موت کا مزہ چکھے۔ ہم اس باب میں تصلیب کے سچے واقعات کی چند باتیں گوشگذار کرتے ہیں۔

۱ ۔ تصلیب اور فلسفہ ۔ قبل از ولادت مسیح فلسفہ کا بازار گرم تھا ملک یونان اس کا دارالسلطنت تھا۔ سقراط اور افلاطون اسکے دو بڑے ارکان تھے۔ یہ عالی دماغ اشخاص اپنے زمانہ کے خیالات کے ہادی اور پیشوا تھے۔ ان میں سے افلاطون اپنے استاد سقراط کے خیالات کا آئینہ تھا۔ ہم اس کی کتاب ریپبلک سے تصلیب کی فلسفیانہ تصویر ناظرین کے ہدیہ کرتے ہیں۔ اس کتاب میں فلاسفر نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ راستی اور انصاف کیا ہے؟ اس نے بصورت مکالمہ راست اور ناراست شخص کی تصویر کھینچی ہے اور دونوں کا تقابل دکھایا ہے اورآخرش ان کے انجام کا ذکر کیا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شخص صادق کوڑے کھائیگا۔ بیڑیاں پہنے گا اس کی آنکھیں نکالی جائینگی اورآخر کا ہر قسم کی تکلیف اٹھانے کے بعد وہ مصلوب ہوگا۔ الخ فلسفہ کا شخص صادق اورراستی مجسم یہی ہے۔ اس بیان میں مسیح کی تصلیب کی جھلک کیسی صاف نمایاں ہے۔ اس کا انجام کیسی صفائی سے درخشا ہے۔

۲ ۔ تصلیب اور نبوت۔ عالم نبوت میں بھی تصلیب نورافشاں ہے ہم اس مقام پر یسعیاہ نبی کی اس فوٹو دکھاتے ہیں جو اس نے شخص صادق عبدیہوواہ کی کھینچی ہے ۔ ترجمہ ۔ دیکھو میرا بندہ اقبالمند ہوگا اور وہ بالا اور ستودہ ہوگا اور نہایت بلند ہوگا۔ جس طرح بہتیرے تجھے دیکھ کر دنگ ہوگئے کہ اس کا چہرہ ہر ایک بشر سے زائد اوراس کی پیکر بنی آدم سے زیادہ بگڑ گئی اسی طرح وہ بہت سی قوموں پر چھڑکیگا۔ الخ۔ وہ اس کے یعنی کے خدا کے آگے کونپل کی طرح پھوٹ نکلا ہے اوراس جڑ کی مانند جو خشک زمین پر سے پنپتی ہو؟ اس کے ڈیل ڈول کی کچھ خوبی نہ تھی اور نہ کچھ رونق کہ ہم اس پر نگاہ کریں اور کوئی نمائش بھی نہیں کہ ہم اس کے مشتاق ہوں۔ وہ آدمیوں میں بے نہایت ذلیل اور حقیر تھا۔ وہ مرد غمناک اوررنج کاآشنا ہوا۔ لوگ اس سے گویا روپوش تھے۔ اس کی تحقیر کی گئی اور ہم نے

اس کی کچھ قدر نہ جانی۔ یقیناً اس نے ہماری مشقتیں اٹھالیں اور ہمارے غموں کا بوجھ اپنے اوپر چڑھایا پر ہم نے اس کا یہ حال سمجھا کہ وہ خدا کا مارا کوٹا اور ستایا ہوا ہے پر وہ ہمارے گناہوں کے سبب گھائل کیا گیا اور ہماری بدکاریوں کے باعث کچلا گیا۔ ہماری ہی سلامتی کے لئے اس پر سیاست ہوئی تاکہ اس کے مار کھانے سے ہم چنگے ہوں۔ ہم سب کی بدکاریاں اس پر لادی۔ وہ تو نہایت ستایا گیا اور غمزدہ ہوا تو بھی اس نے اپنا منہ نہ کھولا۔وہ جسے برہ جسے ذبح کرنے لے جاتے ہیں اور جیسے بھیڑ اپنے بال کترنے والوں کے آگے بے زبان ہے اسی طرح اس نے اپنا منہ نہ کھولا۔ایذادے کے اور اس پر حکم کرکے وہ اسے لے گئے پر کون اس کے زمانہ کا بیان کریگا ؟ کہ وہ زندوں کی زمین سے کاٹ ڈالا گیا میرے گروہ کے گناہوں کے سبب اس پر مار پڑی۔ اس کی قبر بھی شریروں کے درمیان ٹھہرائی گئی تھی پر وہ اپنے مرنے کے بعد دولتمندوں کے ساتھ ہوا کیونکہ اس نے کسی طرح کا ظلم نہ کیا اوراس کے منہ میں ہر گز چھل نہ تھا لیکن خداوند کو پسند آیا کہ اسے کچلے۔ اس نے اسے غمگین کیا جب اس کی جان گناہ کے لئے گذارنی جاوے تو وہ اپنی نسل کو دیکھیگا اوراس کی عمر دراز ہوگی اور خدا کی مرضی اس کے ہاتھ کے وسیلہ برآویگی۔ اپنی جان ہی کا دکھ اٹھاکے وہ اسے دیکھیگا اور سیر ہوگا اوراپنی ہی پہچان سے میرا صادق بندہ بہتوں کو راستباز ٹھہرائیگا کیونکہ ان کی بدکاریاں اپنے اوپر اٹھالیگا۔ الخ۔

عالم نبوت میں شخص صادق اورراستباز عبد اللہ کی یہی تصور ہے جو دوسروں کے گناہوں کی سزاخود اٹھاتا اوران کو راستباز بناتاہے۔ ان نبوت کا مصداق کون ہے؟ اس کا جواب انجیل میں خود ہی موجود ہے۔ ایک حبشی خوجہ حبشیوں کی ملکہ کنداکا کا ایک وزیر اپنی رتھ پر بیٹھا ہوا یسعیاہ نبی کی کتاب کی تلاوت کرتا تھا۔ وہ عبارت جو وہ پڑھ رہا تھا یہی تھی کہ لوگ اسے بھیڑ کی طرح ذبح کرنے کو لے گئے اور جس طرح برہ اپنے بال کترنے والے کے سامنے بے زبان تھا اسی طرح وہ اپنا منہ نہیں کھولتا۔ الخ۔ اس کی ملاقات کو رسول فلپس آیا اور خوجے نے اس سے کہا میں تیری منت کرکے پوچھتا ہوں کہ نبی یہ کس کے حق میں کہتاہے ؟ اپنے یا کسی دوسرے کے ؟ فلپس نے اسی نوشتہ سے شروع کیا اوراسے سیدنا مسیح کی خوشخبری دی۔ اس نے اس کو بتایا کہ اس نبوت میں سیدنا مسیح کے کفارہ کا ذکر ہے اور خوجہ مسیحی ہوگیا۔

۳۔ تصلیب اور تواریخ۔ عالم فلسفہ اورعالم نبوت سے عبور کرکے اہل فکر جب عالم تواریخ میں قدم دھرتاہے تو محض تصلیب ہی نہیں پر مرد مصلوب بھی اس کو نظر آتاہے۔ ہم مسیح مصلوب کی تصلیب کی تاریخی شہادت اب پیش کرتے ہیں۔ وہ شخص صادق جس کا فلسفہ کو کچھ خیال آیا تھا۔ وہ عبد یہوواہ جس کا کفارہ یسعیاہ نے رویا میں دیکھا تھا۔ وہ سچ مچ اس دنیا میں آیا اور فی الحقیقت اس نے اپنی جان دی۔ وہ موا اور مصلوب ہوا۔ اس کی تصلیب کی شہادت کے لئے ذیل کی باتیں کافی ہیں۔

اول حواریوں کی شہادت ۔ (الف) سیدنا مسیح کی سوانح عمری چار حواریوں نے تحریر کی ہے اورچاروں اس بات پر متفق ہیں کہ مسیح مصلوب ہوا۔

چاروں اس کاذکر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسیح کی موت اوراس کی پیدائش سے زیادہ غور اور مطالعہ کے قابل ہے۔ نہایت ہی غور کا مقام یہ ہے کہ اس کی تولید کابیان صرف دوحواری یعنی مقدس متی اور لوقا کرتے ہیں پر اس کی موت کا بیان چاروں کرتے اور کوئی بھی اس کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔علاوہ بریں مسیح کی تصلیب کا نہ صرف چاروں بیان ہی کرتے پر ان کا بیان بڑی صراحت اوروضاحت سے ہوتاہے ۔ وہ اس واقعہ کا کوئی مجمل حال نہیں پر اس کی مفصل کیفیت تحریر کرتے ہیں۔ اس کےعلاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نہ صرف انہوں نے مسیح کی زندگی کے حالات قلمبند کرتے وقت اس کی موت کا ذکر کیا بلکہ ان کی تعلیم اور وعظ اور بحث اوردینی مسائل کے ریشے ریشے کے اندر کوٹ کوٹ کر مسیح کی موت اور اس کی قیامت بھری ہوئی ہے۔ اخلاق کی ترقی انکے خیال میں اس پر مبنی ہے باہمی فرائض کا ادا کرنا اس پر مبنی ہے۔ مغفرت اور نجات کی نعمت اسی پر مبنی ہے۔ ایک لفظ میں کہو تو یوں کہو کہ ساری مسیحیت اسی پر مبنی ہے۔! ان کے یہ بیان کے پڑھنے سے معلوم ہوتاہے کہ کہ عوام کی نگاہ میں صلیب حقارت کی علامت ہے پر ان کے لئے وہ باعث فخر اور ان کے سر کا تاج ہے۔ مسیح کی تاریخی موت نے صلیب کی ندامت کومصلوب کردیا اسی لئے فی زمانہ وہ شائستگی کی روشنی میں رہبانوں کے سینوں اور بادشاہوں کے تاج پر نظر آتی ہے۔ اس تبدیلی کا سبب کیاہے؟ وہ بجز تصلیب مسیح کے اور کیا کچھ ہوسکتاہے ؟

(ب) مسیح کی موت اس کی رضا اوراس کی خوشی سے ہوئی ۔ مقدس یوحنا کابیان ہے کہ جس وقت لوگ اس کو گرفتار کرنے آئے وہ ان کی ملاقات کوآگے بڑھا اوران سے دریافت کیاکہ تم کسے تلاش کرتے ہو انہوں نے کہا ۔ عیسیٰ ناصری کو۔ مسیح نے فرمایا کہ میں ہوں اس کلام کو سنتے ہی وہ پیچھے ہٹے اوراوندھے منہ گر پڑے۔ یہ واقعہ دوبارہ ہوا اور وہ رعب مسیح سے مغلوب ہوگئے ۔ پھر مسیح نے ان سے فرمایا کہ اگر تم مجھے ڈھونڈھتے ہو تو ان شاگردوں کو چھوڑدو اور یوں مسیح نے خود اپنے تئیں ان کے حوالہ کیا۔

(ج) مسیح کی پیشی رومی حاکم پنطس پلاطوس اورہیرودیس کے آگے ہوئی اوردینی عدالت میں بھی وہ اناس کیفاس کےروبرولایا گیا اور انہوں نے اس پر قتل کافتویٰ لگایاپر چونکہ ان کوموت کی سزا دینے کا اختیار نہیں تھاوہ پلاطوس پاس اس کولے گئے اور وہاں اس پر رومی قانون کے موافق صلیب کاحکم ہوا۔

(د) تصلیب کے وقت مسیح کی پسلی چھیدی گئی اوراس سے لہو اور پانی نکلا۔ معلوم ہوتاہے کہ یہ پانی اور لہو اس کے حجاب القلب سے نکلا۔ جس وقت سپاہی نے برچھی سے پہلو کو چھیدا اس وقت وہ برچھی اول حجاب القلب کے اندرگئی اوروہاں سے پانی آیا اورحجاب القلب سے گذر کروہ دل تک پہنچی جس سے خون آیا۔ اس مقام سے ظاہر ہے کہ مسیح کی موت کاطبی سبب اس کے قلب کا پھٹ جانا تھا" اور جس نے یہ دیکھا گواہی دی اوراس کی گواہی حق ہے اوروہ جانتاہے کہ سچ کہتاہے تاکہ تم ایمان لاؤ"۔

(ہ) مسیح کی موت اس کی اختیاری بات تھی۔ یہ نہایت غور طلب امر ہے۔ مسیح موت سے مغلوب نہیں ہوجاتا ۔ موت اس کو نہ دباتی اور نہ دبوڑتی ہے بلکہ وہ خود اپنی جان آپ ہی سے دیدیتا ہے ۔ اس عجب عمل کا ذکر قابل یاد ہے اور یہی وجہ ہے کہ چاروں انجیل کے لکھنے والے اس بات کو تحریر کرتے ہیں مثلاً مقدس متی نے یہ لکھا کہ " سیدنا عیسیٰ نے پھر بڑے شور سے چلا کر جان دی" اور مقدس مرقس نے کہا کہ " سیدنا عیسیٰ نے بڑی آواز سے چلا کر دم چھوڑ دیا اور مقدس لوقا نے یوں بیان کیا کہ " سیدنا عیسیٰ نے بڑی آواز سے پکار کر کہا کہ اے باپ میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں۔ یہ کہکے دم دیدیا اور مقدس یوحنا نے یہ فرمایا کہ " سیدنا مسیح نے کہا تمام شد اور سر جھکا کر جان دی"۔

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ مسیح کی موت اس کی اختیاری بات تھی اور مسیح کا یہ عمل بعینہ اس کے اس قول کے موافق تھا کہ باپ یعنی خدا مجھے اس لئے پیار کرتا ہے کہ میں اپنی جان دیتا ہوں تاکہ میں اسے پھر لوں کوئی شخص اسے مجھ سے نہیں لیتا پر میں اسے آپ سے دیتا ہوں میرا اختیار ہے کہ اسے دوں اور میرا اختیار ہے کہ اسے پھر لوں یہ حکم میں نے اپنے باپ سے پایا۔ مقدس یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۸ ۔

وہ شخص جو کفارہ کو سمجھنا چاہتا ہے چاہیے کہ مسیح کی موت کے ان نکات کو فراموش نہ کرے کیونکہ اس لاثانی موت کے راز کی مفتاح کم از کم یہ ضرور ہے کہ مسیح نے خوشی سے اپنی جان دی اور اسکی موت کسی غیر کا فعل نہیں پر خود اس کی اختیاری بات تھی"۔

دوم۔ رومی مورخ ٹسا ئیٹس کی شہادت۔

ہم نے انجیل سے مسیح کی تصلیب کا ثبوت دیا اور انجیل کو اس موقعہ پر محض تواریخ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس انجیلی شہادت کی تصدیق رومی مورخ بنا ٹسا ئیٹس بھی کرتاہے۔ ہم اس مقام پر اسکی اصل لاطینی عبارت شائقین کی خاطر نقل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ اس نادر واقعہ کا ذکر غیر مسیحی کتاب میں موجود ہے اور وہ کتاب بھی ایسی جو تواریخ کے نام سے مشہور ہو۔

Lucit Annal xv.44.
Quosvulgus Christianos appelleabat. Auctor nominis giou Christus.Tiberio impertante per procuratonem pontium pilatume suppliciodfectus eratsrepresague in praeseno exitiablis superstitis rurous erampelbat non mado per judaiam origenem gius mali sed per werben etiam etc.

ترجمہ۔ مسیحی نام کا بانی ایک شخص مسیح نامی طائبریس بادشاہ کے عہد میں پنطوس پیلاطوس کے ایام حکومت میں اس کے حکم سے مارا گیا الخ۔ دیکھو کیسا صاف مسیح کی موت ایک غیر مسیحی کے قلم سے تحریر کی گئی ہے۔

تصلیب اور قول مسیح۔ مسیح نے تین خاص موقعوں پر اپنی موت کا ذکر کیا اور تصلیب کے قبل اس امر کا اعلان کردیا اول موقعہ قیصریہ فلپی کے علاقہ میں جب مسیح تھا اس وقت اس نے اپنے شاگردوں پر یہ بات ظاہر کی کہ مجھے ضرور

ہے کہ یروشلیم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے
بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں اور تیسرے دن جی اٹھوں۔ دوسرا موقعہ جس
وقت مسیح کفر نحوم شہر کو لوٹ گئے اس وقت آپ نے ان سے فرمایا کہ ابن آدم
آدمیوں کے حوالہ کیا جائیگا اور وہ اسے قتل کرینگے اور وہ تیسرے دن زندہ کیا
جائے۔ متی باب ۱۷ آیت ۲۲۔ تیسرا موقعہ جس وقت مسیح یروشلیم شہر کو
جاتے تھے آپ نے اپنے بارہ رسولوں کو الگ بلا کر راہ میں ان سے فرمایا کہ دیکھو ہم
یروشلیم کو جاتے ہیں اور ابن آدم سردار کاہن اور فقیہوں کے حوالہ کیا جائے گا اور وہ
اس کے قتل کا حکم دینگے اور اسے غیر قوموں کے حوالہ کرینگے تاکہ وہ اسے ٹھٹھوں
میں اڑائیں اور کوڑے ماریں اور صلیب پر چڑھائیں اور وہ تیسرے دن زندہ کیا
جائیگا۔ متی باب ۲۰ آیت ۱۷ تا ۱۹۔

تصلیب اور قرآن

قرآن شریف صاف الفاظ میں مسیح کی تصلیب کا انکار کرتا ہے۔ سورہ
نساء آیت ۱۵۷ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَـكِن شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ
اخْتَلَفُواْ فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلاَّ اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا
قَتَلُوهُ يَقِينًا بَل رَّفَعَهُ اللّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا
ترجمہ: اور نہیں قتل کیا اسے اور نہ صلیب دی اسے لیکن دھوکا ہوا ان کو اور بیشک
جو مختلف ہوئے قتل میں عیسیٰ کے البتہ شک اور تردد میں تھے اس قتل سے نہیں۔
ہے ان کو اس کا علم مگر پیروی گمان کی اور نہیں قتل کیا اس کو یقینی طور پر بلکہ
اٹھالیا اسے اللہ نے اپنی طرف اور ہے اللہ غالب حکمت والا خلاصتہ التفاسیر کے
مصنف اور مولوف مولوی فتح محمد تائب لکھنوی نے اس آیت کی تفسیر یوں کی
ہے کہ اس کہنے سے عذاب نازل ہوا کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو قتل کیا حالانکہ نہ
قتل کرسکے نہ سولی دے سکے یہ ہوا کہ جس نے حضرت عیسیٰ کی خبر بادشاہ ظالم کو
دی تھی اسے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی صورت پر کردیا وہ لوگ اسے عیسیٰ سمجھے
اور سولی دیدی پھر وہ اپنی اصلی صورت پر آگیا یہود کو اس میں شبہ پڑا اور تردد ہوا کہ
آیا ہم نے قتل کیا یا نہیں تو یہ قول کہ حضرت عیسیٰ کو قتل کیا محض گمان پر ہے
اور حق یہ ہے کہ نہ قتل کیا نہ سولی دی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے حضور میں بلالیا
اور آسمان پر اٹھالیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

سورہ آل عمران آیت ۵۷ میں اس کے متعلق یہ آیت آئی ہے کہ
وَمَكَرُواْ وَمَكَرَ اللّهُ وَاللّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ترجمہ اور مکر کیا انہوں نے اور مکر
کیا اللہ نے اور اللہ بہتر ہے مکر کرنے والوں سے۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ
حضرت عیسیٰ یہود کے ایک گروہ کی طرف سے گذرے وہ کہنے لگے وہ آیا جادوگر
جادوگر کا بیٹا اور بدکار بیٹا زانیہ (معاذ اللہ منہا) آپ غضبناک ہوئے اور بددعا کی
اور کہا اے اللہ تو میرا رب اور میں تیری بنائی ہوئی روح سے نکلا اور تیرے حکم سے
پیدا ہوا اے اللہ لعنت کر جس نے مجھے اور میری ماں کو گالی دی فوراً وہ سب گستاخ
بے ادب سور بن گئے یہود کے بادشاہ نے یہ دیکھا تو ڈرا کہ مبادا میرا بھی یہی حال ہوا
اور یہود آپ کے قتل پر مجمع ہوگئے اور آپ کو ایک مکان میں بند کیا جبرئیل بحکم

رب جلیل آئے اورایک روزن سے آپ کو آسمان پر اٹھا لے گئے بادشاہ نے طیطانوس نامی اپنے مصاحب کو حکم دیا کہ اس مکان میں جاکر حضرت عیسیٰ کو شہید کرے اندر جانا تھا کہ صورت بدل گئی جب نکلا تو لوگوں کو نظر میں ایسا معلوم ہوا کہ یہی عیسیٰ ہیں اسے قتل کیا اور سولی پر چڑھایا (خلاصتہ التفاسیر) تفسیر حسینی کا بیان اس آیت پر یہ ہے کہ انواع واقسام کے حیلوں سے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کیا اور گھر میں قید کرکے رات بھر رکھا اور صبح تڑکے اکٹھا ہو کر اپنے سردار کو کہ اس کا نام یہودا تھا گھر میں بھیجا کہ عیسیٰ کو باہر لائے اسی شب حضرت عیسیٰ کو حق تعالی نے آسمان پر اٹھالیا جیسے ہی یہودا اس گھر میں آیا عیسیٰ کو نہ پایا حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی شبیہ اس پر ڈالدی جب باہر نکلا اور یہ کہنا چاہتا تھا کہ عیسیٰ یہاں نہیں ہے وہ لوگ اس سے لپٹ گئے ہر چند وہ کہتا ہی رہا کہ میں فلاں شخص ہوں اور نالہ اور فریاد کیا کچھ نہ ہوا سولی پر چڑھا کہ لوگوں نے تیر برسائے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے مکر کیا اور خدا نے مکر کی جزا انہیں دی کہ انہوں نے اپنے ہی یار سردار کو بڑی ذلت کے ساتھ قتل کیا۔

قرآن کی الجھن ۔ اوپر کی آیات سے ظاہر ہے کہ مسیح کی موت ازروئے قرآن ہر گز نہیں ہوئی بلکہ لوگوں کو اس معاملہ میں بڑا دھوکا ہوا اور پھر بھی قرآن میں ایسے مقامات ہیں جن سے معلوم ہوتاہے کہ مسیح کی موت ہوئی ۔ ہم دومقام پیش کرتے ہیں مقام اول إِذْ قَالَ اللّهُ يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُواْ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُواْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (سورہ آل عمران آیت ۵۵)۔ ترجمہ جب کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں وفات دینے والا ہوں تجھ کو اور اٹھالینے والا تجھ کو اپنی طرف اور ظاہر کرنے والا ہوں تیرا ان سے جو کافر ہوئے اور کرنے والا ہوں ان کا جو پیرو ہوئے تیرے غالب ان پر جو کافر ہوئے روز قیامت تک۔

مقام دوم۔ وَإِذْ قَالَ اللّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَـهَيْنِ مِن دُونِ اللّهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلاَ أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنتَ عَلاَّمُ الْغُيُوبِ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلاَّ مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ (سورہ المائدہ آیت ۱۱۵ تا ۱۱۷)۔ ترجمہ اور جب کہا اللہ نے اے عیسیٰ ابن مریم کیا تونے کہا آدمیوں کو بنالو مجھے اور میری ماں کو معبود سوائے اللہ کے کہا پاک ہے تو نہیں مجھے یہ قدرت کہ کہوں میں وہ کہ نہیں میرے لئے حق اگر میں نے کہا تھا اسے پس بیشک جانتاہوگا تو اسے ۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور نہیں جانتا میں جو تیرے جی میں ہے بیشک تو بڑا جاننے والا ہے غیبوں کا ۔ میں نے نہیں کہا ان سے مگر جو حکم کیا تونے مجھے اس کا یہ کہ پرستش کروں اللہ کی رب میرا ہے اور رب تمہارا اور میں تھا ان پر شاہد جب تک تھا میں ان میں۔ پھر

جب وفات دی تونے مجھے تھا تو محافظ ان پر اور توہرشئے پر گواہ ہے ۔ان دو مقامات میں مسیح کی موت کا ذکر آیا ہے اور معنی آیت میں اختلافات کثیرہ پیدا ہیں۔ بعض نے موت قبل رفع سما اور بعض نے بعد نزول کے مانا ہے بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے مسیح تین یا پانچ ساعت مردہ رہے پھر زندہ ہو کر آسمان پر گئے۔

قرآن کا یہ تناقض اورالجھن مفسرین سے حل نہیں ہوپاتا ہے خاص کر سورہ المائدہ کی آیت مفسرین کو تنگ کرتی ہے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي اور اس لئے وہ حدیث کی پناہ میں مسیح کی موت کے تو قائل ہیں پر قبل از رفع سما نہیں پر بعد نزول ازآسمان ۔ جو کچھ ہوا اسلام مسیح کی تصلیب کا منکر ہے ۔ اوراس کا یہ انکار حضرت محمد ﷺ کی عدم نبوت پر دال ہے۔ اگرہم ان کی نبوت کو قبول کریں توایسے بڑے تواریخی واقعہ کو باطل جانیں اوران انبیاء کے اقوال کو جو اس موت کی خبر دیتے آئے جھوٹا مانیں اور نیز مسیح کے کلام کی جس نے اپنی تصلیب کا خود ذکر کیا تکذیب کریں ! بھلا محقق کو یہ کب گوارہ ہوسکتا ہے کہ وہ مسیحی اور غیر مسیحی شہادتوں کو باطل کہکر محض حضرت محمد ﷺ کا کہنا مان لے۔ ہمارا فیصلہ تویہی ہے کہ اگر ان کو ایسے بڑے واقعہ کی خبر نہ تھی توان کی یہ بے خبری اور لاعلمی ان کی نبوت پر حرف لاتی ہے اور نبی ہونیکی نفی کررہی ہے ۔ تصلیب کی نفی ان کی نبوت کی نفی ہے جس طرح سے قرآن الجھن میں پڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سے مفسرین بھی تاویل کرنے میں پریشان ہیں کوئی یہ کہتاہے کہ یہوداہ مصلوب ہوا کوئی یہ کہتا ہے کہ بادشاہ کا مصاحب طیطانوس مصلوب ہوا کوئی یہ کہتا ہے کہ موت قبل از رفع تین یا پانچ ساعت کوہوئی کوئی کہتاہے کہ بعد نزول آسمان ہوئیگی۔ یہ سب قرآن کی اس آیت کے مصداق نظر آتے ہیں۔ لاتبتدوالحق بالباطل وتکمتیوالحق۔

تصلیب پراعتراضات مع انکے جوابات

افسوس کہ فی زمانہ کے محمدی اس قدر متعصب ہورہے ہیں کہ قرآن کی تائید میں انجیل ہی سے تصلیب کی نفی ثابت کرنیکی کوشش کرتے ہیں چنانچہ ایک معترض صاحب کا یہ قول ہے کہ " خود انجیلوں میں مفصلہ ذیل واقعات درج ہیں جن سے ثابت ہوتاہے کہ صلیب پر وفات پاجانے کی نسبت بے ہوشی اور غشی کی حالت میں حضرت عیسیٰ کا ہوجانا زیادہ قرین قیاس اور اغلب ہے (۱) پیشینگوئی یونس (۲) مسیح صرف چند گھنٹے صلیب پر رہے(۳)آپ کی ہڈیاں نہ ٹوٹیں (۴)آپ کے پہلو سے خون نکلا جو زندہونے کی علامت ہے(۵) پلاطوس کویقین نہ آیا کہ مسیح مرگئے (۶) دوسرے مجرموں کی طرح دفن نہ کیا گیا بجائے نیچے زمین ایک فراغ جگہ میں دفن ہوا(۷) عبرانیوں کے باب ۵ ۱ اور آیت ۷ سے ثابت ہوتاہے کہ آپ موت سے بچ گئے۔

ہم مختصراً ان کے جوابات یہاں عرض کرتے ہیں جن سے معلوم ہوجائیگا کہ معترض کسی قدر تحقیق کرنے کا مادہ رکھتا اورکہاں تک اس کا دعویٰ حق ہے۔

۱ ۔ پیشینگوئی یونس"۔ معترض کی غرض اس مقام پر یونس نبی کے نشان سے ہے جس کا ذکرانجیل میں یوں آیا ہے ۔ جیسا یونس تین رات دن مچھلی

کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہیگا ۔ مقدس متی باب ۱۲ آیت ۴۰۔ معترض کا اعتراض یہ ہے کہ جس طرح یونس نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا اسی طرح مسیح قبر میں نہیں مرا بلکہ زندہ تھا۔ پر فی الحقیقت معترض نے اس تشبیہ کو ہر گز نہیں سمجھا۔ اس مقام پر مسیح کے قبر میں رکھے جانے کی طرف کوئی اشارہ نہیں بلکہ مسیح کا شاول یعنی عالم ارواح میں جانے کی طرف اشارہ ہے اور اسی لئے مسیح نے یہ فرمایا ہے ابن آدم تین رات دن زمین کے دل کے اندر رہیگا اور زمین کے دل کے اندر رہنا قبر میں رہنا نہیں پر شاول میں اترجانا ہے۔ یہ قول بعینہ یونس نبی کے کلام سے ملتا ہے کیونکہ وہ بھی مچھلی کے پیٹ میں رہنے کو بطن شاول میں رہنا کہتے ہیں (دیکھو کتاب یونس باب ۲ آیت ۲)۔ اور یہ دونوں کلام یعنی بطن شاول اور زمین کے دل کے اندر رہنا اس تشبیہ کی وجہ شبہ ہے پس یہی وہ ایک معنی ہے جس میں اس تشبیہ کا مشبہ اور مشبہ بہ شریک ہے۔

۲۔ مسیح کا چند گھنٹے صلیب پر رہنا اس کی موت کی نفی نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی موت خود اس کے اختیاری فعل سے ہوئی جیسا ہم اس باب کے شروع میں بیان کرآئے ہیں کہ اس نے اپنی جان خود بڑی آواز سے چلا کردے دی۔

۳۔ مسیح کی ہڈیاں نہ توڑیں گئیں اور اس کی وجہ صاف انجیل ہی میں مذکور ہے ۔ پس چونکہ تیاری کا دن تھا یہودیوں نے پلاطوس سے درخواست کی کہ ان کی ٹانگیں توڑدی جائیں اور لاشیں اتارلیجائیں تاکہ سبت کے دن صلیب پر نہ رہیں کیونکہ وہ سبت کا ایک خاص دن تھا پس سپاہیوں نے آکر پہلے اور دوسرے شخص کی ٹانگیں توڑیں جو اس کے ساتھ مصلوب ہوئے تھے لکن جب انہوں نے سیدنا مسیح کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مرچکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑیں ۔ مقدس یوحنا ۱۹ باب آیت ۳۱تا۳۳۔

۴۔ مسیح کے پہلو سے خون نکلا جو زندہ ہونے کی علامت ہے۔ انجیل کا بیان یہ ہے کہ جب انہوں نے مسیح کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مرچکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے خون اور پانی بہ نکلا۔

ڈاکٹر سٹراوڈ۔ ایم ۔ڈی کی تحقیق سننے کے قابل ہے آپ کا بیان ہے کہ مسیح کی موت اس کے دل کے پھٹ جانے کے باعث ہوئی اور دل کے پھٹنے کے ساتھ ہی خون حجاب القلب میں اترآیا یہ حجاب القلب وہ جھلی ہی جو دل کو غلاف کئے ہوتی ہے۔ وہاں یہ خون دوحصوں پر منقسم ہوگیا ایک جز کا نام کرا سمینٹم ہے جو گاڑھا اور سرخ ہوتاہے اور دوسرے جز کا نام واٹری سیرم ہے جو سیال اور آبی رنگ کا ہوتا ہے ۔ یہ عموماً اس خون کی کیفیت ہے جو چھوٹی شریانوں سے خارج ہوجایا کرتا ہے۔ جس وقت سپاہی نے برچھی سے وار کیا اس وقت حجاب القلب جو کرا سیمٹنم اور سیرم سے پُرہوچکا تھا نیچے سے کھل گیا اور بہ نکلا جس کو پاک نوشتوں کے بیان کے موافق " پانی اور خون" کہا ہے۔اس بیان سے ظاہر ہے کہ مسیح کے پہلو سے نہ صرف خون نکلا بلکہ پانی اور خون دونوں نکلا اور یہ اس کے دل کے پھٹ

جانے سے ہوا اور یہ تو ظاہر ہے کہ جس شخص کا دل پھٹ جائے وہ کسی حالت میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

۵۔ پلاطوس کو یقین نہ آیا کہ مسیح مر گیا۔ انجیل کا بیان یہ ہے کہ ارمتیہ کا رہنے والا یوسف آیا جو عزت دار مشیر اور خود بھی پروردگار کی بادشاہی کا منتظر تھا اس نے جرات سے پیلاطس کے پاس جا کر آپ کی جسمِ مبارک مانگا۔ پیلاطس نے تعجب کیا کہ آپ ایسے جلد وفات پاگئے اور صوبہ دار کو بلا کر آپ سے پوچھا کہ آپ کو وفات پائے ہوئے دیر ہو گئی ؟ جب صوبہ دار سے حال معلوم کرلیا تو جسمِ مبارک یوسف کو دلادی ۔(مرقس باب ۱۵ آیت ۴۲تا۴۳)۔ اس مقام سے ظاہر ہے کہ رومی حاکم نے رومی صوبہ دار سے پہلے مسیح کی موت کی تحقیق کرلی اور تب لاش لے جانے کا حکم دیا۔

۶ ۔ مسیح ایک فراغ جگہ میں دفن کیا گیا اور دوسرے لوگوں کی طرح نیچے زمین نہیں دفن کیا گیا گویا معترض کا کہنا یہ ہے کہ ایک خاص قسم کی قبر میں دھرے جانے کے باعث مسیح وہاں غش میں پڑا رہا اور مرا نہیں۔ پر انجیل سے معلوم ہوتاہے کہ کوئی خاص قبر مسیح کے لئے تیار نہیں کی گئی تھی بلکہ وہ قبر جس میں مسیح رکھا گیا دراصل یوسف ارمتیہ نے اپنے لئے کھدوائی تھی۔ یہ قبر اور قبروں کے موافق چٹان میں کھودی گئی اور مثل اور قبروں کے اسکے منہ پر بھی ایک بڑا پتھر رکھد یا گیا تھا۔اس کی ایک مثال انجیل یوحنا میں خود موجود ہے اور وہ لعزر کی قبر ہے جس کی نسبت یہ لکھا ہواہے کہ " وہ ایک غار تھا اور اس پر پتھر دھرا تھا"۔ اس مقام سے ظاہر ہے کہ جس قبر میں مسیح رکھا گیا اور جس میں لعزر رکھا گیا وہ ایک ہی طرح سے بنائی گئی تھیں لہذا مسیح کی قبر دیگر یہودیوں کی قبروں کے موافق تھی پس معلوم ہوا کہ معترض کا مقدمہ غلط اور اس لئے نتیجہ بھی غلط !

۷۔ عبرانی باب ۵ اورآیت ۷ میں یہ لکھاہے کہ اس نے اپنی بشریت کے دنوں میں زور زور سے پکار کر اور آنسو بہا بہار کر اسی سے دعائیں اور التجائیں کیں جو اس کو موت سے بچاسکتا تھا اور خدا ترسی کے سبب اس کی سنی گئی اس آیت کو پڑھ کر معترض یہ کہتاہے کہ مسیح مرنے سے بچ گیا کیونکہ خدا سے اس نے دعا کی کہ موت کا پیالہ مجھ سے ہٹ جائے اور وہ دعا سنی گئی لہذا مسیح موت سے بچ گیا۔

اس کے جواب میں دو باتیں قابل غور ہیں اول یہ کہ عبرانیوں کے خط کا مصنف اس بات کا قائل تھا کہ مسیح فی الحقیقت مر گیا اوراسی کی موت گناہوں کے کفارہ میں ہوئی ۔ وہ صاف الفاظ میں مسیح کی موت کا ذکر بار بار کرتاہے ۔ ہم چند مقامات سے خط سے نقل کرتے ہیں جہاں مسیح کی موت کا ذکر ہے"۔ البتہ ان کو دیکھتے ہیں جو فرشتگان سے کچھ ہی کم کئے گئے یعنی سیدنا عیسیٰ کو کہ موت کا دکھ سہنے کے سبب سے بزرگی اور عزت کا تاج انہیں پہنایا گیا ہے تاکہ پروردگار کی مہربانی سے آپ ہر ایک آدمی کے لئے موت کا مزہ چکھیں(عبرانیوں ۲ باب آیت ۹)۔" پس جس صورت میں کہ لڑکے خون اور گوشت میں شریک ہیں تو وہ خود بھی ان کی طرح ان میں شریک ہوا تاکہ موت کے وسیلہ سے جسے موت پر قدرت حاصل تھی یعنی ابلیس کو نیست ونابود کردے (عبرانیوں ۲ باب آیت ۱۴)۔

اور جس طرح آدمیوں کے لئے ایک بار مرنا اور اس کے بعد عدالت کا ہونا مقرر ہے۔ اسی طرح سیدنا عیسیٰ مسیح بھی ایک بار بہت لوگوں کے گناہ اٹھانے کے لئے قربان ہوکردوسری بار بغیر گناہ کے نجات کے لئے ان کو دکھائی دیں گے جو آپ کی راہ دیکھتے ہیں۔(عبرانیوں ۹ باب آیت ۲۸)۔

پس اے بھائیو! چونکہ ہمیں سیدنا عیسیٰ مسیح کے خون کے سبب سے اس نئی اور زندہ راہ سے پاک مکان میں داخل ہونے کی دلیری ہے۔جو آپ نے پردہ یعنی اپنے جسمِ مبارک میں سے ہوکر ہمارے لئے نامزد کی ہے۔(عبرانیوں ۱۰ باب آیت ۱۹)۔

ان آیات سے صاف آئینہ کی مانند نظر آتاہے کہ عبرانیوں کے خط کا مصنف اس بات کا قائل تھا کہ مسیح مرگیا اس نے اپنا خون بہایا کہ اس کی موت گناہوں کے کفارہ میں ہوئی ۔ پس ظاہر ہے کہ معترض کی پیش شدہ آیت سے مسیح کی موت کی نفی ہر گز نہیں ہوسکتی ہے۔

دوم۔ معترض کی پیش کی ہوئی آیت کے صحیح مفہوم سے اعتراض بالکل دفع ہوجاتاہے۔ یادرکھنا چاہیے کہ اس آیت میں مسیح کے اس دکھ کی طرف اشارہ ہے جو اس نے باغ گتسمنی میں اٹھایا کیونکہ اسی موقع پر اس نے دعا اور التجا کی کہ اے باپ اگر تو چاہے تو یہ پیالہ میرے پاس سے ہٹالے تاہم میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو اور خدا نے اس کی یہ دعا سنی جیسا عبرانیوں کے خط کی پیش شدہ آیت سے ظاہر ہے ۔ مسیح باغ میں سخت تکلیف میں تھا۔انجیل میں لکھاہے کہ اس وقت اس کی جان نہایت غمگین تھی یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی تھی اوراس کا پسینہ گویا خون کی بڑی بڑی بوندیں ہوکر زمین پر ٹپکتا تھا اور اسوقت ایک فرشتہ اس کو تقویت دیتا تھا۔ مسیح کی یہ حالت موت کی حالت تھی اوراسے باغ ہی میں مرجانے کا اندیشہ تھا۔وہ سوچتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہیں تمام ہوجاؤں اور صلیب کی نوبت نہ آئے لہذا اس نے اس موت سے رہائی پانے کی دعا کی اور وہ دعا سنی گئی کہ مسیح باغ گتسمنی میں نہیں مرمٹا بلکہ صلیب نصیب ہوئی ۔ اب یہ بات صاف ہوگئی کہ وہ موت جس سے وہ بچ گیا صلیب کی موت نہیں ہے کیونکہ اس کا ذکر اس خط کا مصنف بار بار کرتاہے بلکہ یہ باغ گتسمنی کی موت ہے جس سے وہ محفوظ رہا!۔

مسئلہ کفارہ

مسیح کی موت کی خاصیت۔ باب ماسبق میں ہم نے مسیح کی موت کی شہادت کا ذکر کیا۔اس باب میں اس وقت موت کی خاصیت کا ذکر کرتے ہیں کیا مسیح کی موت معمولی انسان کی موت تھی ؟ کیا وہ کسی پہلوان رستم زماں کی موت تھی؟ کیا وہ کسی مصلح یا فلاسفر کی موت تھی جو اپنی تعلیم کی صداقت پر اپنے خون سے دستخط کرنا سعادت سمجھتا تھا؟ مسیح کی موت ان شخصوں کی موت سے کہیں

بہتر تھی۔ ہم خود اس کے ہی منہ سے اس کی موت کی خاصیت کا حال سنوادیتے ہیں ۔ جب وہ کھارہے تھے توسیدنا عیسیٰ المسیح نے روٹی لی اور برکت دے کر توڑی اور صحابہ کرام کو دے کر فرمایا لوکھاؤ یہ میرا بدن ہے پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور ان کو دے کر فرمایا تم سب اس میں سے پیو۔ کیونکہ یہ میرا وہ عہد کا خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے۔(متی ۲۶ باب آیت ۲۶ تا ۲۸)۔پھر اس نے ایک اورموقع پر کیسا صاف فرمایا کہ ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اوراپنی جان بہتوں کے بدلے فدیے میں دے۔ مقدس مرقس ۱۰ باب آیت ۴۵۔

ان مقامات سے ظاہر ہے کہ مسیح کی موت گناہوں کی مغفرت اورانسان کے فدیے میں ہوئی ۔ایک لفظ میں اگر یہ ادا کیا جائے تو وہ یوں کہا جائیگا کہ مسیح کی موت کفارہ کی موت ہے۔ کفارہ اس کی موت کی خاصیت ہے۔

کفارہ۔ لفظ کفارہ کے کیا معنی ہیں؟ کفارہ عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ لفظ کفر سے مشتق ہوا ہے۔ کفر کے معنی ڈھانپنے یا کسی چیز کو پوشیدہ وپنہاں کرنے کے ہیں ۔ گناہ جب پوشیدہ کیا جاتاہے تو اس کا کفارہ ہوتاہے یعنی وہ شخص جس کا گناہ ڈھانپا جاتا ہے مغفور ہوتاہے۔

لفظ کفارہ قرآن شریف میں تین مقام پر آیا ہے اول سورہ مائدہ رکوع ۷ میں لکھاہے کہ جس نے جسم کا بدلہ تصدق کردیا اس کے لئے کفارہ ہوگیا۔ دوم اسی سورہ کے بارہویں رکوع میں آیا ہے کہ خدا بے فائدہ قسموں میں تمہیں نہ پکڑیگا۔ مگر پکی قسموں میں پکڑیگا پس پکی قسموں کے کفارہ میں دس محتاج کو کھلانا ہے۔ اوسط کا کھانا جو اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ سوم۔ اسی سورہ کے تیرھویں رکوع میں لکھاہے کہ اے ایماندارو جب احرام میں ہوشکار نہ مارو اور جس نے عمداً شکار مارا اس کا بدلا برابر کا مویشی دینا ہوگا جو تم میں دو معتبر شخص تجویز کرینگے قربانی کعبہ میں بھیجنا یا اس کا کفارہ چند محتاجوں کو کھانا دینا۔

توریت میں لفظ کفارہ۔ عبرانی زبان میں اس لفظ کفارہ کا استعمال بار بار آیا ہے اوراس کے لغوی معنی اس زبان میں بھی پوشیدہ کرنے اور ڈھانپنے کے ہیں۔ کم از کم اسی مقامات پر اپنی مختلف صورتوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ لغوی معنی کے علاوہ اس لفظ کے اصطلاحی معنی بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ مسیحی دین کی اصطلاح میں کفارہ وہ فعل ہے جس کے ذریعہ خدا اورانسان میں میل ہوتاہے۔

انسان خدا سے جدا ہے۔ اس جدائی کا باعث گناہ ہے اوراسلئے کفارہ کی حقیقت کو وہی سمجھ سکتاہے جس نے گناہ کی ماہیت کو خوب سمجھ لیا ہے ہم مختصراً اس مقام پر گناہ کے مسئلہ پر فکر کرینگے تاکہ مسئلہ کفارہ کے سمجھنے میں آسانی ہوجائے۔

گناہ اور اس کے نتائج

۱ ۔ انسان حیوان ہے اورحیوان سے برتر اور بزرگتر ہے۔وہ حیوان ہے اوران کے موافق گوشت پوست سے بنا ہے پر وہ ان سے بزرگتر بھی ہے اور یہ دواعتبار سے اول اس لئے کہ وہ صاحب اختیار ہے خدا نے اس کو تمام حیوانات کا

سر دار بنایا ہے اور ان پر حکومت کرتا ہے اور جو کچھ نام وہ انکار رکھتاہے اسی سے وہ
وہ دنیا میں یاد کئے جاتے ہیں اور یہ اس کی بزرگی کی دلیل ہے۔ دوم وہ اپنی ذات
کے اعتبار سے سارے حیوانات سے بالکل علیحدہ ہے۔ وہ خدا کی صورت پر پیدا کیا
گیاہے۔ وہ نہ صرف حیوانی مخلوق ہے پر روحانی شخص بھی ہے حیوانی زندگی کی بنا
پر وہ روحانی بنایا گیا۔ فانی زندگی کی بنا پر غیر فانی پیدا کیا گیا۔ محدود نفسانی زندگی
کی بنا پر وہ صاحب اخلاق اور خود مختار بنایا گیا۔

پر افسوس اس کی موجودہ حالت اس کی اصلی حالت نہیں ہے ۔ اس نے
اپنے منصب کو کھودیا ہے۔ اس کا اختیار اس کے ہاتھ سے جاتارہاہے۔ وہ اب حاکم
نہیں پر محکوم ہے۔ اب روحانی نہیں پر نفسانی اور شیطان ہے۔

۲ ۔ اس کا یہ نقشہ کیونکر بگڑگیا؟ رشتہ مابین خدا اور انسان ایسا رشتہ ہے
جس میں اطاعت اور بغاوت دونوں ممکن ہے۔خدا چاہتاہے کہ انسان میری
اطاعت کرے پر جبراً وہ کسی سے اطاعت نہیں کرواتا ہے ورنہ اطاعت کی خوشی
اور عبادت کا مزہ جاتا رہتا لہذا اس کی حالت امیدواری کی حالت ہے۔ وہ نیکی کا
امیدوار ہے۔ وہ معصوم پیدا کیا گیا اور اس کی عصمت یعنی نیک ہو نیکی قابلیت
بذریعہ سیاست اور اطاعت کی تحصیل نیکی کا باعث ہوسکتی ہے۔ اس کے انجام
دینے کے لئے خدا نے اس ک شریعت عطا کی ہے۔ اس شریعت کی اطاعت اسکو
نیک بناتی ہے اور اس کی بغاوت اس کو نیک نہیں یعنی بد بناتی ہے۔

۳۔ اس بدی کا ذکر الکتاب یعنی بائبل میں کئی طور سے آیا ہے۔ وہ لفظ جو
عموماً اس کے لئے استعمال ہوا عبرانی میں خطبات ہے جس کے معنی خطا کے ہیں۔
گناہ کو گویا زندگی کے نشانہ سے خطا کرجاناہے۔ چوک جانا ہے۔ قاصر ہوجانا ہے پر
گناہ نہ صرف قاصر ہونا ہے پر وہ کجروی بھی ہے۔ نہ صرف نشانہ کی خطا ہے پر
ٹیڑھی راہ پر چلنا بھی ہے اور اس لئے اس کا ذکر لفظ عاون سے آیا ہے۔ عاوہ کے معنی
ٹیڑھے ہونیکے ہیں اور گناہ سراط مستقیم کے خلاف ہے۔ وہ کجروی ہے۔ پھر گناہ کا
ذکر آوین لفظ سے ہوا ہے جس کے معنی بطالت ہے۔ گناہ نیکی کی بطالت ہے وہ
نیکی کا نہ ہونا ہے۔ وہ عدم نیکی ہے۔ وہ فائدہ کے عوض باعث نقصان ہے۔ پر
اس کی ایک خوفناک صورت بھی ہے اور اس کا بیان لفظ پیشع سے ہوا ہے اور اس
سے شریعت کی بغاوت مراد ہے۔ اس ساری تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ گناہ ایسا فعل
ہے جو صاحب اخلاق اور روحانی مخلوق سے ہوسکتاہے ۔ وہ ایسے شخص کی کرتوت
ہے جو نیک اور بدمیں تمیز کرسکتا ۔ جو صاحب ارادہ ہےاور اس لئے ان ہر دو سے
کسی نہ کسی کو قبول اور اختیار کرسکتاہے۔ وہ الہیٰ مرضی کی اطاعت کرسکتا یا اس سے
بغاوت کرسکتاہے۔

۴۔سیدنا مسیح نے گناہ کے مسئلہ پر ایک اور بات کہی ہے۔ انہوں نے یہ
بتایاہے کہ گناہ محض فعل ہی نہیں پر وہ حالت ہے۔ انہوں نے یہ سکھایا ہے کہ گناہ
صرف ظاہرہ فعل ہی سے صادر نہیں ہوتا پر وہ دل کی بگڑی حالت سے پیدا ہوتاہے
ایک جملہ میں اگر کہا جائے تو یوں کہنا چاہیے کہ " انسان نہ صرف گناہ کرتا ہے بلکہ

وہ گنہگار ہے"۔ وہ جو جسم سے پیدا ہوا جسم ہے اور وہ جو روح سے پیدا ہوا روح ہے۔ زیرا کہ ازدل برمیاید خیالات بدوقتلہا دزنا ہا وفقہا دوز یہادشہادات دروغ و کفرہا(متی باب ۱۵ آیت ۱۹)۔

سیدنا مسیح نے اپنی تعلیم سے یہ بھی ظاہر کیا کہ خدا کے حقوق اور انسان کے فرائض کے مابین ایک حقیقی تعلق اور رشتہ ہے۔ وہ محبت ہے محبت ہی شریعت کی تکمیل ہے۔ محبت ہی شریعت اور انبیا کا خلاصہ ہے۔

گناہ سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ ایک لفظ میں اگرکہا جائے تو موت ہے اور اسکی تشریح دوطور پر ہوتی ہے اول جسمانی موت یعنی انسان کی روح کا انسان کے جسم سے علیحد ہوجانا۔خدا نے آدم کو جس وقت کہ اس نے گناہ کیا یہی سزا دی کہ وہ فانی ہوگیا۔ حق تعالیٰ کا یہ قول تھا کہ جس روز آدم شجر ممنوعہ کو کھائیگا اسی روز مرجائیگا۔ دوم یہ موت نہ صرف انسانی روح کا انسانی جسم سے علیحدہ ہوجانا تھا بلکہ انسان کا خدا کی قربت اور رفاقت سے جُدا ہوجانا تھا اور یہ اسی روز شروع ہوا جس روز اور جس گھڑی آدم نے گناہ کیا اس کا بیان یسعیاہ نبی نے بڑی خوبی سے یوں کیا ہے کہ" دیکھو خداوند کا ہاتھ چھوٹا نہیں کہ بچا نہ سکے اوراس کا کان بھاری نہیں کہ سن نہ سکے بلکہ تمہاری بدکاریاں تمہارے اور تمہارے خدا کے درمیان جدائی کرتی ہیں" باب ۵۹ آیت اول۔

گناہ کی سزا یہی ہے ۔ گنہگار مجرم ہے اورمرتکب جرم ہو کر وہ قابل سزا ہے اوراس کی سزا اور مزدوری موت ہے۔ رسول کاقول نہایت ہی صاف ہے کہ "گناہ کی مزدوری موت ہے"۔

علاج۔ قربانی کارواج گناہ کاعالمگیر علاج ہے۔

دنیا کی مذہبی تواریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتاہے کہ ہر ملک اورہر گروہ اور قوم میں قربانی کا رواج رائج تھا اوراب تک کم وبیش رائج ہے ۔ لوگوں کی مذہبی عقل نے قربانی کو قربت الہیٰ کا ذریعہ قبول کیا ہے اوراس کے وسیلے خدا کے غضب کے اورعتاب سے پناہ چاہی ہے ۔ ہم سرسری طورپراس کا عالمگیر ہونا اس موقعہ پردکھایا چاہتےہیں ۔ اس کی تفصیل یوں ہے۔

اول۔ قربانی کارواج غیر اریانی اقوام میں ۔ ہم اس کے ثبوت کے لئے دور نہ جائینگے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں اب تک غیر اریانی قومیں مثل سنتال اور پہاڑی اور گونڈاور بھیل موجود ہیں۔ ان میں آج کے روز تک قربانی کا رواج پایا جاتاہے۔ وہ اپنے معبود کے غضب سے پناہ پانے کے لئے یا تو بکرا یامرغ قربانی کرتےہیں۔

دوم۔ اریانی قوم میں قربانی کا رواج۔ اس کے ثبوت کے لئے ہندوؤں کی قدیم کتاب وید کافی ہے۔ اس میں گناہ سے رہائی کا راستہ قربانی بتلایا جاتاہے رگوید میں آیا ہے کہ توقربانی کے وسیلے ہمارے تمام گناہوں کو ہم سے دور کردے۔ اسی وید میں ایک مشہور باب پروش سکت کہلاتاہے اس میں یہ بیان

ہے کہ دیوتاؤں نے پروش کو جو ادی یعنی ازل میں مولود ہوا تھا قربان کیا۔ پھر ست پتھ برہمنا میں آیا ہے کہ پرجاپتی یعنی مخلوقات کے خداوند نے اپنے تئیں ان کے لئے دیدیا کیونکہ وہ ان کی قربانی بن گیا۔ پھر تیتریا ارنیکا میں آیا ہے کہ انہوں نے پروش کو ذبح کیا اس پرش کو ازل سے پیدا ہوا تھا۔

سیم۔ قوم یہود میں قربانی کا رواج۔ اس قوم کی مذہبی زندگی قربانیوں پر بہت کچھ موقوف تھی۔ قربانی ان کی عبادت اور نماز کا جز تھی۔ وہ گویا ان کی جان تھی۔ ان میں کئی طرح کی قربانیاں رائج تھیں۔ مثلاً سوختنی قربانی اور نذر کی قربانی اور سلامتی کی قربانی اور خطا کی قربانی اور تقصیر کی قربانی۔ انکا مفصل حال موسیٰ کی توریت میں مندرج ہے اور شائقین سے عرض ہے کہ وہ ان کا مطالعہ کریں۔

کفارہ کا دن۔ پروردگار نے موسیٰ کو خطاب کرکے فرمایا کہ میں بدلی میں کفارہ گاہ پر دکھائی دونگا اور ہارون سردار کاہن پاکترین مکان میں یوں آئے کہ خطا کی قربانی کے لئے ایک بچھڑا اور سوختنی قربانی کے لئے ایک مینڈھا لائے اور وہ اپنا بدن پانی سے دھوئے اور کتانی پوشاک پہنے اور جماعت سے بکری کے دو بچے خطا کی قربانی کے لئے اور ایک مینڈھا سوختنی قربانی کے لئے لیوے اور ہارون اپنے اس بچھڑے کی جو خطا کی قربانی کے لئے اس کی طرف سے ہی نزدیک لائے اور اپنے لئے اور اپنے گھر کے لئے کفارہ دے۔ پھر ان دونوں حلوانوں کو لے کر جماعت کے خیمہ پر قرعہ ڈالے ایک قرعہ خداوند کے لئے اور دوسرا قرعہ چلادے کے لئے اور ہارون اس حلوان کو جس پر خداوند کے نام کا قرعہ پڑے لاوے اور اسے خطا کی قربانی کے لئے ذبح کرے پر وہ جس پر قرعہ پڑے کے چلاوانهوں خداوند کے آگے جیتا حاضر کرے تاکہ اس سے کفارہ دیا جائے۔(اس کا باقی حال احبار کے باب ۱۶ میں درج ہے)۔

اسلام میں قربانی کا رواج۔ اسلامی کتابوں میں قربانی کا ذکر چھ الفاظ سے کیا گیا ہے۔ (۱) ذبح۔ قرآن میں یہ لفظ سورہ بقر کی آیت ۶۳، ۱۴۶ اور سورہ مائدہ آیت ۱۴ اور سورہ صافات آیت ۱۰۱ میں آیا ہے (۲) قربان، یہ قرآن میں صرف دودفعہ آیا ہے سورہ آل عمران آیت ۱۷۹ اور سورہ مائدہ میں۔(۳) نحر اونٹ کی گردن کاٹنے کو کہتے ہیں اور یہ لفظ قرآن میں صرف سورہ کوثر میں آیا ہے۔ (۴) اضحیہ قرآن میں نہیں پر حدیث میں آیا ہے۔ (۵) ھدی قرآن میں چار دفعہ آیا ہے۔ (۶) منسک جس کے معنی ریت رسم کے ہیں قرآن کے سورہ حج میں آیا ہے۔

قرآن شریف میں قربانی کا ذکر یوں آیا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَى مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذَٰلِكَ

سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِن يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنكُمْ

ترجمہ: اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی کا طریقہ مقرر کیا تاکہ وہ مویشی چارپاؤں کے ذبح پر جو اس نے انہیں دیئے اللہ کا نام یاد کریں۔ پس تمہارا ایک ہی اللہ ہے اس کے مطیع ہو اور بشارت دے ان عاجزوں کو۔

اور اونٹ بنائے ہم نے تمہارے لئے اللہ کے نشان ان میں تمہارے لئے خیر ہے۔ جب وہ قطار باندھے کھڑے ہوں ان پر اللہ کا نام پڑھو جب وہ اپنی کروٹوں پر گرپڑیں ان میں سے کھاؤ اور بے سوال وبے سوال فقیر کو کھلاؤ یوں ہم نے تمہارے قابو میں کئے شاید تم کو شکر کرو۔ ان کا گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

قرآن میں خدا حضرت محمد ﷺ کو قربانی کرنے کا حکم دیتا ہے چنانچہ سورہ کوثر میں آیت آئی ہے إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

ترجمہ۔ مقرر دیا ہم تجھ کو اے محمد حوض کوثر پھر نماز پڑھ اپنے رب کی اور قربانی کر۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی تفسیر میں اس مقام پر یہ فرماتے ہیں کہ حقیقت نحر اور ذبح کی یہ ہے کہ شکر الہیٰ کے مقام میں مال اور جاہ کا اور دوسری مرغوب چیزوں کا خرچ کرنا معمول سب آدمیوں کا ہے لیکن جان دینا دستور نہیں اس واسطے اس شریعت میں جان دینے کے عوض ذبح کرنا اور توظاہر میں مال دینی کی صورت اور حقیقت ہے۔

قرآن کے علاوہ حدیث میں بھی قربانی کرنے کا ذکر ہے چنانچہ مشکواۃ باب فی الاضحیۃ میں آیا ہے۔ وعن عائشہ ان رسول اللہ ﷺ امر بکبش اقرن لطافی سوادو برک فی سواد ینظر فی سواد فاتی بتہ تضحی۔ بہ قال یا عائشہ ہلمی المدینہ ثم قال اسحذیھا حجر فعلت ثم اخذ ھاواخذ الکبش فاضحہ ثم ذبحہ ثم قال بسم اللہ اللھم تقبل من محمدو من الہ محمہ ثم ضحی بہ راوہ سلم۔

روایت ہے کہ عائشہ سے یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم کیا ساتھ لانے دنبے سینگدار کے کہ چلتا ہو سیاہی میں اور بیٹھتا ہو سیاہی میں اور دیکھتا ہو سیاہی میں پس لائے گئے تاکہ قربانی کریں اس کو فرمایا حضرت نے اے عائشہ چھری لے آؤ پھر فرمایا تیز کر اس کو پتھر پر پس تیز کی میں نے پھر لیا اس کو اور پکڑا دنبے کو پس لٹایا اس کو پھر اس کے ذبح کا ارادہ کیا پھر کہا بسم اللہ یا الہیٰ قبول کر محمد سے اور آل محمد سے اور امت محمد سے پھر قربانی کی اس کو۔ یہ مسلم نے روایت کی ہے۔

پھر اسی باب میں یہ روایت بھی ہے۔ ترجمہ اور روایت ہے زید بن ارقم سے کہا کہ کیا اصحاب رسول خدا نے اے رسول خدا کے کیا ہے یہ قربانی فرمایا طریقہ ہے تمہارے باپ ابرہیم کا۔ عرض کیا صحابہ نے پس کیا ثواب ہے ہمارے واسطے۔ فرمایا ہر بال کے بدلے نیکی ہے۔ عرض کیا صحابہ نے پس صوف اے رسول خدا کے۔ فرمایا کہ لے ہر بال کے پشم میں سے ایک نیکی ہے روایت کی یہ احمد اور ابن ماجہ نے۔

حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ قربانی کا جانور چاہیے کہ عیب سے مبرہ ہو۔وعن علی قال امرنا رسول اللہ ﷺ ان نستشرف العین والاذن وان نضحے بمقابلتہ ولامدابرۃ الخ۔ اورروایت ہے کہ حضرت علی سے کہا کہ حکم کیا ہم کو رسول اللہ نے ﷺ یہ کہ خوب دیکھیں ہم قربانی کی آنکھ اور کان کو اور نہ قربانی کریں ہم ساتھ اس جانور کے کہ کٹا ہو کان اگلی طرف سے یا پچھلی طرف سے اور نہ اس جانور کو کہ اس کے کان چرے ہوئے ہوں درازیا پھٹے ہوں گول اور روایت کی یہ ترمذی اورابوداؤد اور نسائی اور وارمی اورابن مانہ ۔ پھر حضرت محمد ﷺ نے یہ بھی فرمایاکہ چار طرح کے جانور قربانی کے قابل نہیں ہیں۔ ایک تو لنگڑا کہ ظاہر ہو لنگڑاپن اس کا اور دوسرا کانا کہ ظاہر ہو کاناپن اس کا اور تیسرا بیمار کہ ظاہر ہو بیماری اور چوتھا دبلا کہ نہ ہو کہ گودا ہڈیوں میں روایت کی یہ مالک اوراحمد اور ترمذی اورابوداؤد اور نسائی اورابن ماجہ اوردارمی نے (مشکواۃ)۔

قربانی کی فلاسفی۔ قربانی کا عالمگیر ہونا تو ثابت ہوچکا اب سوال یہ پیدا ہوتاہے کہ اس عالمگیر رواج کی غایت اور حقیقت کیا ہے؟ کوئی راز ضرور ہوگا ورنہ اس کے عالمگیر ہونے اور شائستہ اور غیر شائستہ عالم میں پھیل جانے کی وجہ کیا ؟ہم تو اس کے عالمگیر ہونے کی وجہ یہی قرین عقل سمجھتےہیں کہ یہ الہیٰ انتظام رہے کہ خدا نے یا توبذریعہ مکاشفہ اورالہام کے یا بذریعہ فطری روشنی کے اس امر کا اعلان کیاکہ قربانی مغفرت اورقربت الہیٰ کاذریعہ ہے اس کے متعلق ذیل کے نکات غور طلب ہیں۔

اول۔ بدوں سفک دم لا تحصل مغفرۃ ۔ ترجمہ "بغیر خون بہائے گناہوں کی مغفرت نہیں"۔ساری قربانی کا یہی اصول ہے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنیکی غرض سے خدا نے قربانیوں کا انتظام سکھایا۔ جب جب خدا کی شریعت توڑی گئی اورالہیٰ حکم عدولی کے باعث انسان گنہگار اور غضب الہیٰ کا سزاوار ہوا تو اس سزا کے دفع ہونے کی صورت یہی تھی کہ وہ قربانی کے ذریعہ سے خدا کی مغفرت کاطالب ہو۔

دوم۔ قربانی قربت الہیٰ کا ذریعہ ہے۔ قربانی کے وسیلے نہ صرف گنہگار انسان پر سے غضب الہیٰ دفع ہوجاتا تھاپر اسکے ذریعہ سے وہ خدا کی نزدیکی حاصل کرتا تھا۔ خدا اور گنہگار شخص کا پھر وہی تعلق پیدا ہوجاتا تھا جو سابق میں ان دونوں کا تھا۔

سوم۔ میری زندگی خدا کے لئے ہے۔وہ میری نہیں پراسی کی ہے جس نے مجھے پیدا کیا اوراسی لئے قربانی میں خون کا بہنا ضروری تھا۔ خون جائے حیات ہے اورخون بہانے سے یہی مراد تھا کہ قربانی کرنے والا اپنی حیات کو خدا تعالیٰ کے نذر کرتاہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جانوروں کی زندگی قربانی کرنے والے کی حیات کے عوض دیجاتی تھی۔ جانوروں کا خون ذبح کرنے والوں کا گویاخون تھاوہ اسکے عوض تھے۔ یہ نکتہ نہایت ہی جاندار ہے۔ کفارہ کا خیال اس مقام پر سے کیسا صاف ظاہر ہورہاہے ۔ قربانی کا فیض اس پر موقوف تھا حتیٰ کہ جب کبھی قربانی کرنے والوں نے جانوروں کی قربانی کی اس حقیقت کا خیال نہیں کیا اورمحض ذبح

کرنے اورظاہری رسومات کی پابندی کالحاظ کیا تو فوراً خدا تعالیٰ نے قربانی کی تکذیب کی اورفرمایاکہ " تمہارے ذبحیوں کی کثرت سے مجھے کون کام میں مینڈھوں کی سوختنی قربانیوں سے اور فربہ بچھڑوں کی چربی سے سیر ہوں اور بیلوں اور بھیڑوں اور بکروں کا خون نہیں چاہتا ہوں۔ (یشعیاہ باب اول) اس قسم کی اور آیات بھی انبیاء کی کتابوں میں ہیں جن سے قربانی کی حقیقت روشن ہوجاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حیات انسانی خدا کےلئے ہے اور قربانی کا گذارننا گویا اپنے جسم اورروح ۔ اپنے ارادہ اور نفس کا نذر کردینا ہے۔ یہ صداقت قربانی کے رواج سے واضح کردی گئی جس میں مجازاً جانور قربان ہوتے پر حقیقتاً انسان قربان ہوتے تھے"۔

چہارم۔ آب آید یتمم برخاست ! دنیا کی ساری قربانی عموماً اورموسوی قربانیاں خصوصاً سیدنا مسیح کی ذبیح آعظم کی عکس تھیں ۔ مسیح ساری قربانیوں کی غایت تھا اورجب وہ آیا اورقربان ہوا تو دیگر قربانیوں کی ضرورت معدوم ہوگئی۔موسوی قربانیاں روزمرہ ہوتی تھیں اوراسی سے ظاہرہے کہ وہ سب کی سب ناکامل تھیں پر مسیح کی قربانی ایک بار ہوئی اوراس کی تاثیر ہمیشہ تک بنی ہے اسی لئے وہ کامل قربانی ہے ۔رسول کی تقریر اس موقع پر سننے کے قابل ہے ۔ آپ فرماتے ہیں۔

جس طرح آدمیوں کے لئے ایک بار مرنا اور اس کے بعد عدالت کا ہونا مقرر ہے۔ اسی طرح سیدنا عیسیٰ مسیح بھی ایک بار بہت لوگوں کے گناہ اٹھانے کے لئے قربان ہو کردوسری بار بغیر گناہ کے نجات کے لئے ان کو دکھائی دیں گے جوآپ کی راہ دیکھتے ہیں۔

کیونکہ شریعت جس میں آئندہ کی اچھی چیزوں کاعکس ہے اور ان چیزوں کی اصلی صورت نہیں ان ایک ہی طرح کی قربانیوں سے جو ہر سال بلاناغہ پیش کی جاتی ہیں پاس آنے والوں کو ہرگز کامل نہیں کرسکتی ۔ ورنہ ان کا پیش کرنا موقوف نہ ہوجاتا ؟ کیونکہ جب عبادت کرنے والے ایک بار پاک ہوجاتے تو پھر ان کا دل انہیں گنہگار نہ ٹھہراتا ۔ بلکہ وہ قربانیاں سال بہ سال گناہوں کو یاد دلاتی ہیں۔ کیونکہ ممکن نہیں کہ بیلوں اور بکروں کا خون گناہوں کو دور کرے۔اسی لئے آپ دنیامیں تشریف لاتےوقت فرماتےہیں کہ

پروردگارِعالم نے قربانی اورمنت کو پسند نہ کیا۔
بلکہ میرے لئے ایک بدن تیار کیا۔
پوری سوختنی قربانیوں اور گناہ کی قربانیوں سے
آپ خوش نہ ہوئے۔
اس وقت میں نے کہا کہ دیکھو! میں آیا ہوں
(کتاب مقدس کے ورقوں میں میری نسبت لکھا ہوا ہے)
تاکہ اے پروردگار آپ کی رضا پوری کروں۔

اوپر تووہ فرماتےہیں کہ نہ آپ نے قربانیوں اور منتوں اور پوری سوختنی قربانیوں اور گناہ کی قربانیوں کو پسند کیا اور نہ ان سے خوش ہوئے حالانکہ وہ قربانیاں

شریعت کے موافق پیش کی جاتی ہیں۔اور پھر یہ فرماتے ہیں کہ دیکھو میں آیا ہوں تاکہ رضائے الہیٰ پوری کروں ۔غرض وہ پہلے کو موقوف کرتے ہیں تاکہ دوسرے کو قائم کریں۔اسی مرضی کے سبب سے ہم سیدنا عیسیٰ مسیح کے جسمِ مبارک کے ایک ہی بار قربان ہونے کے وسیلہ سے پاک کئے گئے ہیں ۔اور ہر ایک امام تو کھڑا ہو کر ہر روز عبادت کرتا ہے اور ایک ہی طرح کی قربانیاں بار بار پیش کرتا ہے جو ہر گز گناہوں کو دور نہیں کرسکتیں ۔لیکن سیدنا عیسیٰ مسیح ہمیشہ کے لئے گناہوں کے واسطے ایک ہی قربانی پیش کرکے پروردگارِ عالم کی دہنی طرف جا بیٹھیں۔

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مسیح ساری قربانیوں کی غایت ہے۔

حمل اللہ الذی یرفع خطئیہ العالم۔ خدا کا برہ جو دنیا کا گناہ اٹھالے جاتا ہے۔ہم نے قربانی کی حقیقت اور غایت کو بیان کیا اور اب یہ ثابت کیا چاہتے ہیں کہ کیونکر مسیح کی موت کفارہ میں ہوئی ؟اس امر کو سمجھنے کے لئے محض مسیح کی موت کے واقعہ کو جاننا نہیں پر اس موت کے حقیقی جوہر سے واقف ہونا ضروری ہے اور وہ حقیقی جوہر مسیح کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری ہے جس کا نتیجہ اس کی صلیبی موت ہے۔ یہ اس شخص کی قربانی ہے جس میں آزمائش کا ہر امکان اور آلہ موجود ہے پر جو پھر بھی ہمیشہ اپنے باپ کی مرضی پر چلتا ہے ۔ جو ہمیشہ اس کی قربت میں رہتا ہے ۔ یہ اطاعت اس کی ساری زندگی سے ٹپکتی ہے اور اسکی موت سے روشن ہوتی ہے"۔وہ بقول رسول فرمانبردار رہا ہاں صلیبی موت تک فرمانبردار رہا"۔یہی اطاعت اس کی قربانی کی جان اور اسکی موت کا جوہر ہے۔

رشتہ مابین مسیح اور شریعت قابل لحاظ ہے۔ راستی کی شریعت ازلی ہے۔ نیکی کا قانون لاتبدیل ہے۔ وہ ذات الہیٰ سے بالکل متحد ہے اس کا انحراف سزا کا سوار ہوجانا ہے۔ اس کا توڑنا سزا وار ہوناہے۔ مسیح اس راستی کی ازلی شریعت سے ہمیشہ محبت رکھتا تھا۔ وہ نیکی کے قانون کی ہمیشہ پیروی کرتا تھا۔وہ پاک اور بے گناہ تھا پھر وہ جو سزاوار ہوا تو کیونکر ۔ موت تو گناہ کی مزدوری ہے پھر وہ مر گیا تو کیوں ؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اسکی موت ہمارے گناہوں کے لئے ہوئی۔

تصلیب کے وقت مسیح نے یہ آواز دی تھی" اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑدیا" ۔ مسیح تو ہمیشہ خدا کی قربت میں رہتا تھا اس کی حیات خدا کی حیات سے پیوستہ تھی پھر اس نے یہ جدائی کیوں محسوس کی؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارا گناہ بردار تھا اور ہمارے گناہوں کے سبب اس نے خدا کی جدائی کو گوارا کیا یہی جدائی ہمارے گناہوں کی سزا تھی اور جب اس نے اس جدائی کو محسوس کیا تو اس نے ہماری سزا اٹھائی۔

کیا یہ انصاف ہے ؟ کیا یہ ہوسکتاہے کہ گناہ تو ہم کریں اور سزا کوئی دوسرا اٹھائے ؟ اس کا جواب مسیح اور انسان کے باہمی تعلق پر موقوف ہے۔ رشتہ مابین مسیح اور انسان کیا ہے؟ مسیح نہ صرف انسان ہے بلکہ وہ الانسان ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ جمیع انسانیت کی ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ جو کچھ انسانیت کا اصلی تصور ہے مسیح اس کی زندہ تصویر ہے۔ انسان کا موجودہ نقشہ یہ

ہے کہ کسی میں شجاعت ہے تو رحمت نہیں اور اگر رحمت ہے تو سختی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس کسی میں کوئی خوبی ہے اور کسی میں کوئی۔ مسیح کی انسانیت کا یہ نقشہ نہیں ہے۔ اس میں جمیع خوبیاں ایک مقام اور اپنے اپنے محل پر پائی جاتی ہیں۔ مسیح کے مجرد رہنے کی یہی وجہ تھی کہ وہ عورت کا محتاج نہ تھا۔ انسان بغیر عورت کے نیم انسان ہے پر مسیح الانسان ہونیکی وجہ سے کامل انسان تھا اور اسکی انسانیت بغیر عورت کے کامل تھی۔

وہ الانسان ہو کر سارے انسان کا سر اور دماغ ہے۔ ہم سب کے سب اس کے اعضا ہیں۔ وہ ہماری اصل ہے ہم سب اس کی شاخیں ہیں وہ گویا اقلب ہے ہم سب شریان۔ پس اس رشتہ کی وجہ سے یہ نہایت ہی معقول اور قرین قیاس ہے کہ جو کچھ انسانیت پر پڑنا تھا وہ سب کچھ اس پر پڑے۔ جو سزا انسان کو اٹھانا تھا اس کو وہ ہمارا سر ہو کر خود اٹھائے۔ جو کچھ اس کے اعضا کو سہنا تھا وہ خود ہمارا دل اور دماغ ہو کر سہہ لے۔ اس میں بے انصافی کہاں ہے!۔

قانون معوضتہ عالم میں موجود ہے۔ یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ کمزور کے لئے مضبوط دکھ اٹھاتا ہے۔ دیکھو والدین اپنے بچوں کے لئے اپنی زندگی دے ڈالتے ہیں۔ ما بوقت تولید قضا کرجاتی ہے۔ خون خوار حیوان اپنی طبیعت کے خلاف تکلیف اٹھا کر اپنے بچے کی پرورش کرتا ہے اور اکثر انکی حمایت میں اپنی جان کھو بیٹھتا ہے۔ پھر یہ بھی مشاہدات میں سے ہے کہ اس عالم میں نیک بد کے لئے تکلیف اٹھاتا ہے۔ انسانی حیات کا یہی نقشہ ہے۔ دنیا کی تواریخ ایسے حادثات سے بھری ہوئی ہے جن سے یہ ظاہر ہے کہ رذیل کی بھلائی شریف کی تکلیف پر اور جاہل کی ترقی عالم کی محنت پر اور ناپاک کی صفائی پاکیزہ کے مصائب پر موقوف ہے۔

اسلام اور فدیہ۔ چونکہ اس کتاب میں دین مسیحی کے مسائل پر اسلام کی روشنی میں بحث کی گئی ہے لہذا ہم اس قانون معوضیہ کو قرآن کے ایک بیان سے واضح کردینگے۔ سورہ صافات میں یہ قصہ ہے کہ خدا نے ابراہیم کو حلیم لڑکے کی بشارت دی اور جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے لگا بولا اے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کررہا ہوں۔ پھر دیکھ تیری کیا رائے ہے۔ بیٹے نے کہا اے باپ جو تجھے حکم کیا جاتا ہے تو کر انشاء اللہ مجھے صابرین میں پائیگا۔ جب دونوں مطیع قربان ہوئے اور اس کو ماتھے کے بل گرایا اور ہم نے اسے پکارا اے ابراہیم تونے خواب سچ کر دکھایا یا یوں ہم نیکوں کو بدلا دیتے ہیں۔ بیشک یہ صریح آزمائش تھی اور ایک بڑی قربانی کے ساتھ ہم نے اس کا فدیہ دیا۔

فدیہ بذبح عظیم۔ اس آیت کے متعلق تین اور امور غور کے قابل ہیں اول قانون فدیہ۔ خدا تعالیٰ اگرچاہتا تو ابراہیم کے فرزند کو بغیر فدیہ کے بچاتا پر وہ ایسا نہیں کرتا ہے۔ وہ اس کا عوض ضرور لیتا ہے۔ اس مقام سے فدیہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔

دوم۔ یہ فدیہ ذبح عظیم کہلاتا ہے۔ قرآن کے مفسرین کہتے ہیں کہ وہ مینڈھا بہت ہی فربہ تھا اور بہشت سے لایا گیا تھا اس لئے عظیم کہلایا پر یہ تو ظاہر ہے کہ

کوئی مینڈھا خواہ دبلا، خواہ موٹا خواہ زمینی خواہ بہشتی کیوں نہ ہو ابن ابراہیم سے عظیم نہیں ہوسکتا ہے۔ حیوان کی عظمت انسان پر کسی معنی میں نہیں ہوسکتی ہے!۔

سوم۔ مسیحی مفسرین اس مینڈھے کو مسیح کی علامت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس مقام پر مسیح کے کفارہ کی طرف اشارہ ہے۔ وہی وہ ذبیح عظیم ہے جو کل بنی آدم پر شرف رکھتا ہے اور جس کی عظمت کی دنیا قائل ہے غور کا مقام ہے کہ اگر خدا ایک حیوان کا فدیہ قبول کرتا ہے تو کتنا زیادہ مسیح الانسان کے فدیہ کو قبول کریگا۔

باب دہم

مسیح قیوم

باب گذشتہ میں ہم نے مسئلہ کفارہ پر بحث کی اور یہ ثابت کیا کہ مسیح ہمارے گناہوں کے لئے موا۔ اس باب میں ہم یہ بیان کیا چاہتے ہیں کہ وہ زندہ ہوا۔

۱۔ قیامت مسیح کی حقیقت۔ مسیح کا زندہ ہونا انجیل مقدس سے ثابت ہے ہم اس واقعہ کو دوبارہ اس مقام پر تحریر نہیں کیا چاہتے ہیں پر عاشقین مذہب سے عرض کرتے ہیں کہ وہ دنیا کی اس عجیب تاریخی حقیقت کو خود انجیل میں پڑھ کر غور کریں ہم صرف ان نکات کو بیان کیا چاہتے ہیں جن سے رشتہ مابین مسیح قیوم اور دین واضح اور روشن ہوجائے۔

۲۔ کفارہ اور مسیح قیوم۔ مسیح کا زندہ ہونا اس کی قربانی کے مقبول ہونے کی دلیل ہے۔ خدا نے اس قربانی کو قبول کیا اور اس لئے مسیح کو زندہ کیا حیات کی اصل کا قبر میں ہمیشہ تک رہنا غیر ممکن امر تھا اوراس لئے وہ چشمہ حیات قبر سے ہو کر بھی رواں ہوا۔ اگر مسیح اورانبیا کے موافق مر کر سڑ گل جاتا تو مسیحی دین کی کوئی خوبی اور فضیلت نہ ہوتی۔ دین عیسوی بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہوجاتا پر چونکہ مسیح زندہ ہے اس لئے وہ دنیا کا نجات دہندہ ہے۔ انجیل میں اس تعلق کو یوں بیان کیا ہے کہ اے بھائیو۔ میں تمہیں وہی خوشخبری جتائے دیتا ہوں جو پہلے دے چکا ہوں جسے تم نے قبول بھی کرلیا تھا اور جس پر قائم بھی ہو اسی کے وسیلے سے تم کو نجات بھی ملتی ہے۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے تم کو وہی بات پہنچادی جو مجھے پہنچی تھی کہ مسیح کتاب مقدس کے بموجب ہمارے گناہوں کے لئے موا اور دفن ہوا اور تیسرے دن کتاب مقدس کے بموجب جی اٹھا اور کیفا اوراس کے بعد بارہوں کو دکھائی دیا پھر پانچ سو بھائیوں سے زیادہ کو دکھائی دیا جن میں سے اکثر اب تک موجود ہیں اور بعض سوگئے پھر یعقوب کو دکھائی دیا پھر سارے رسولوں کو اورسب سے پیچھے مجھ کو جو گویا ادھورے دنوں کی پیدائش ہوں دکھائی دیا۔ پھر رسول آگے چلکہ یہ فرماتا ہے کہ اگر مسیح نہیں جی اٹھا تو ہماری منادی بے فائدہ اور تمہارا ایمان بھی بے فائدہ!

۳۔ مسیح قیوم اور نجات۔ نجات کیا ہے؟ اول گناہ کی سزا سے رہائی یہ سزا مسیح نے ہمارے لئے ہمارا سردار ہو کر خود اٹھائی اور یوں ہم اس سزا سے نجات پاتے ہیں پر محض سزا سے رہائی پانی نجات نہیں ہے۔ نجات کا دوسرا جز پاکیزگی ہے۔وہ نہ صرف سزا سے بچنا ہے پر گناہ سے پاک ہونا ہے۔ یہ پاکیزگی ہم کو مسیح قیوم سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ زندہ ہے اوراس لئے گناہ سے بچنے کی قوت عطا کرتا ہے اس قوت کا نام روح القدس ہے جو مسیح قیوم سے صادر ہو کر مومنین کو فیض بخشتا ہے ۔ مسیح ہمارے گناہوں کے لئے موا اور ہماری راستی کے لئے زندہ ہوا۔

روح القدس کی قوت سے اسلام اور نیز دنیا کے سارے مذاہب ناآشنا ہیں اس فیض کا پہنچانے والا صرف سیدنا مسیح ہے۔ روح القدس اسی کا انعام ہے جس کو اس نے زندہ ہونے کے بعد دنیا پر بھیج دیا اور اس وقت وہ آج تک ساری دنیا میں عموماً اور مسیحی مومنین میں خصوصاً سکونت کرتا ہے۔

۴۔ ایک اعتراض اوراس کا جواب ! مولوی محمد چراغ الدین متوطن جموں نے ایک کتاب بنام منارت المسیح تصنیف کی ہے۔ اس میں آپ نے کفارہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ " حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے بارہ میں مسیحیوں کا عام خیال ہے کہ وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہوا۔ سو یہ خیال مضر ہے کیونکہ اس کا نتیجہ اطاعت اللہ اوعمال صالحہ کی اتباع سے نہ صرف روکنا بلکہ اس کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھنا اوراپنے تیئں آزادی کے میدان میں منہ زور گھوڑے کی طرح چھوڑدینا ہوسکتا ہے جس سے انسان نہ صرف اطاعت حق سے محروم بلکہ اپنی روحانی تکمیل کے حصول میں بھی قاصر اور ناکام رہتا ہے یہ اعتراض بہت ہی بوسیدہ ہے پولوس رسول کے زمانہ میں بھی یہ پیش کیا گیا اوراس کا جواب بھی رسول سے مل چکا ہے ہم اسی جواب کو اس مقام پر نذر کرتے ہیں ۔ پس ہم کیا کہیں ؟ کیا گناہ کرتے رہیں تاکہ مہربانی زیادہ ہو؟ر گز نہیں ہم جو گناہ کے اعتبار سے مرگئے کیونکر اس میں آئندہ کو زندگی گذاریں؟ کیا تم نہیں جانتے کہ ہم جتنوں نے سیدنا عیسیٰ مسیح میں شامل ہونے کا اصطباغ لیا تو ان کی موت میں شامل ہونے کا اصطباغ لیا؟پس موت میں شامل ہونے کے اصطباغ کے وسیلہ سے ہم ان کے ساتھ دفن ہوئے تاکہ جس طرح سیدنا عیسیٰ مسیح پروردگار کی بزرگی کے وسیلہ سے مردوں میں سے زندہ کئے گئے اسی طرح ہم بھی نئی زندگی میں چلیں۔ کیونکہ جب ہم ان کی موت کی مشابہت سے ان کے ساتھ پیوستہ ہوگئے تو بیشک ان کے جی اٹھنے کی مشابہت سے بھی ان کے ساتھ پیوستہ ہوں گے ۔چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری پرانی انسانیت ان کے ساتھ اس لئے مصلوب کی گئی کہ گناہ کا بدن بے کار ہوجائے تاکہ ہم آگے کو گناہ کی غلامی میں نہ رہیں۔ کیونکہ جو مرا وہ گناہ سے بری ہوا۔پس جب ہم سیدنا عیسیٰ مسیح کے ساتھ مرے تو ہمیں یقین ہے کہ ان کے ساتھ جئیں گے بھی۔ کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ سیدنا عیسیٰ مسیح مردوں میں سے جی اٹھے ہیں تو پھر نہیں مرنے کے موت کا پھر ان پر اختیار نہیں ہونے کا ۔ کیونکہ سیدنا عیسیٰ جو قربان ہوئے گناہ کے اعتبار سے ایک بار قربان ہوئے اب جو جیتے ہیں تو پروردگارِ عالم کے اعتبار سے

جیتے ہیں ۔اسی طرح تم بھی اپنے آپ کو گناہ کے اعتبار سے مردہ مگر رب العالمین کے اعتبار سے سیدنا عیسیٰ مسیح میں زندہ سمجھو۔

پس گناہ تمہارے فانی بدن میں بادشاہی نہ کرے کہ تم ان کی خواہشوں کے تابع رہو۔اور اپنے اعضا جھوٹ کے ہتھیار ہونے کے لئے گناہ کے حوالہ نہ کیا کرو بلکہ اپنے آپ کو مردوں میں سے زندہ جان کرخدا تعالیٰ کے حوالہ کرو(خطِ رومیوں باب ۶ آیت ۱ سے ۱۲)۔

اس سے زیادہ واضح جواب اور کیاہوسکتا ہے۔ مسیح کا کفارہ جو اس کی محبت کی علامت ہے ہم کو گناہ کرنے سے روکتا ہے کیونکہ کون اپنے محبوب کے دل کو رنجیدہ کیا چاہتا ہوگا ! ۔گناہ کی نسبت ہم مرگئے ہاں مرتے جاتے ہیں کیونکہ صلیبی موت بتدریج ہوا کرتی ہے اورپاکیزگی میں ہم زندگی گذارتے ہیں کیونکہ مسیح زندہ مسیح ہے۔

۵۔ مسیح کی قیامت حیات کے معموں کی تفسیر اور شرح ہے۔دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں نےآئندہ حیات کی بابت بہت کچھ دماغ لڑایا ہے پر انکی کی تقریریں قطعی حکم نہیں رکھتی ہیں اور غلطی سے خالی ہیں مثلاً ہند کے رشیوں نے تناسخ کو مانا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یونان کے بعض حکماء نے بھی اس مسئلہ کو قبول کیا ہے قرآن کا بیان آئندہ حیات اوربہشت کا نفسانی رنگ لئے ہوئے ہے۔وہاں حضرت محمد صاحب کے خیال میں مخمل کے بچھونے ، سونے کے بڑے بڑے پیالے۔ شراب اورمیوے ، ستھری گوری عورتیں ہونگی!۔

مسیح کی قیامت نے ایسے بیانات کے بطلان کو روشن کردیا ہے اس کی حیات زمان اورمکان کی قید سے بعد جی اٹھنے آزاد ہوتی ہو گئی ۔

صدق اللہ العظیم